رجسٹر ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۳ عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

ایک اہم اعلان

ہم یہ اعلان کرتے ہوئے دلی مسرت محسوس کرتے ہیں اور اس سعادت کے لئے خدائے قدوس کا شکر ادا کرتے ہیں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک باقاعدہ معاہدہ کے ذریعہ سرورق صفحہ تین پر درج اپنی ساری تصنیفات کی طباعت و اشاعت اور تقسیم و تجارت کے جملہ حقوق ہمیں دے دئے ہیں اور ہم نے ان کتابوں کی طباعت کا کام شروع بھی کر دیا ہے۔ اس وقت بازار میں کاغذ کی نایابی کی جو صورت پیدا ہو گئی ہے، یہ جلدی دور ہو گئی تو ان میں سے حسب ذیل کتب انشاء اللہ ہم دسمبر ۱۹۵۹ء کے اندر اندر ہی بازار میں لے آئینگے۔

(۱) رسالہ دینیات (اردو)
(۲) رسلہ دینیات (انگریزی) **Towards Understanding Islam**
(۳) خطبات
(۴) اسلام اور جدید معاشی نظریات
(۵) اسلام اور اس کے اصول و مبادی
(۶) توحید و رسالت اور زندگی بعد موت کا عقلی ثبوت
(۷) سلامتی کا راستہ
(۸) اسلام اور جاہلیت
(۹) اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر
(۱۰) انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل

ان کے علاوہ حسب ذیل کتب بھی انشاء اللہ ان کے ساتھ ہی طبع ہو کر آ جائیں گی۔

* اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام — از چوہدری بہاول خان ناگرہ ریٹائرڈ اے وی آئی سکولز

* نبیوں کے حالات حصہ اول تا چہارم — از مولانا عبدالحی، مدیر الحسنات رامپور

* اخلاقی کہانیاں حصہ اول تا چہارم — مولانا افضل حسین، ایم اے ایل ٹی

المشتہر - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ (کراچی)
برانچ پیسہ اخبار اسٹریٹ انارکلی - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۵۹ء	جلد ۵۳

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلیشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور
سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اسلام نے جس طرح اپنے نظام میں انسان کے فطری واعیات کا پورا پورا اہتمام کیا ہے اور کوئی چیز ایسی پیش نہیں کی جو اُس کی فطرت سے میل نہ کھاتی ہو بالکل اسی طرح اُس نے اپنی تعلیمات لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے استدلال کے قریب قریب وہی طریقے اختیار کیے ہیں جو عام فہم ہیں اور انسانی عقل وفکر سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اگر انسان کے دل ودماغ کو تعصبات اور ذاتی اغراض نے بالکل ماؤف نہ کر دیا ہو تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ کوئی شخص انہیں سنے اور دینِ حق کو قبول کرنے سے اعراض کرے۔

"عام فہم" کا لفظ سُن کر کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم الہامی طرزِ استدلال اور افہام وتفہیم کے عام طریقوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ مالک الملک جس احسن طریق سے اپنے بندوں کو سمجھا سکتا ہے کوئی دوسرا اُس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ ان الفاظ سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسانی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے استدلال کے وہی انداز اختیار کیے ہیں جن سے ہمارے دل ودماغ بالعموم آشنا ہیں اور پھر ان کے اندر اعجاز کی شان پیدا کی ہے۔ یہ چیز ایک انسان ہونے کی حیثیت سے ہمارے مناسبِ حال بھی ہے۔ اس ذاتِ بے ہمتا نے انسانوں کی ہی ایک زبان میں فصیح وبلیغ کلام نازل فرمایا جس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی اور جسے دیکھ کر فوراً یہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ الہامی کتاب کسی غیر انسانی زبان میں ہی نازل ہوتی تو نوعِ بشری کے لیے اس کے اعجاز کو جاننا محال ہوتا۔ اسی طرح اگر انبیا علیہم السلام نوعِ انسانی میں سے مبعوث نہ ہوتے اور ہماری رہنمائی کا فرض فرشتوں کو سونپ دیا جاتا تو ہم پر کبھی اتمامِ حجت نہ ہوتا۔ یہی وہ اصل وجہ ہے جس کی بنا پر انسانوں ہی میں سے بعض بزرگ وبرتر ہستیوں کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تاکہ وہ لوگوں میں رہ کر معاشرتی

ذمہ داریوں سے لدکر، انسانی کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہو کر خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں اور انسانی فطرت کے محرم راز بن کر اُن کی اس طریق سے تہذیب کریں کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کی تیاری میں معروف رہیں۔

اسلام نے اپنی تعلیمات لوگوں کے دلوں میں اتارنے کے لیے بھی یہی فطری اصول پیش نظر رکھا ہے اور غور و فکر اور بحث و استدلال کے انہیں مروجہ طریقوں سے کام لیا ہے جن سے نوع بشری فطری طور پر واقف چلی آرہی ہے۔ البتہ اُن کی ترتیب کا جو انداز اُس نے اختیار کیا ہے وہ فقید المثال ہے اور اس میں اعجاز کی پوری شان جھلکتی ہے۔

ان صفحات میں آج ہم قرآن مجید کے طرز استدلال پر ہی چند گزارشات پیش کریں گے۔

کسی اصول یا نظریہ کی صحت کے لیے لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لازماً کسی خارجی دلیل کا محتاج ہے۔ مگر دنیا میں بے شمار حقائق ایسے ہیں جن کو ہم فطری طور پر مانتے چلے جاتے ہیں اور ان کی صداقت کے بارے میں ہمیں کبھی شک و شبہ نہیں گزرتا۔ اُن کا اقرار ہماری فطرت میں داخل ہوتا ہے اور انہیں تسلیم کرنے کے لیے ہمارا وجدان ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ اگر ہم ان بدیہی حقائق کو تسلیم نہ کریں تو ہم اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرتے ہیں۔

وجودِ خالق کے اعتقاد کو بھی قرآن مجید انہی بدیہی حقائق میں سے ایک بڑی حقیقت سمجھتا ہے۔ یہ اعتقاد فطرتِ انسانی کا ایک لازمی جزو ہے اور دلائل و براہین کی ترتیب و تدوین سے قبل بھی انسان کے دل و دماغ میں راسخ ہو چکا تھا۔ ایک انگریز لڑکے، ایک اَن پڑھ مسلمان، ایک تعلیم یافتہ ہندو یا افریقہ کے کسی وحشی یا کسی عالم و فقیہ سے پوچھیے کہ خدا کیا ہے اور پھر اُن کے جوابات کو غور سے دیکھیے تو سب کی تہ میں ایک ہی بات نظر آئے گی یعنی کسی بلند و بالا ذات کا تصور جو اس کائنات کی علتِ اولیٰ ہے۔ مسٹر

میکڈانلڈ جو مدت تک افریقہ کی وحشی قوموں میں رہے ہیں اپنی کتاب "افریقین" میں لکھتے ہیں کہ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی شے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور اس کائنات کا منبع و مبدا ہے آخر انسان کے اندر وہ کونسا ایسا احساس تھا جس نے انسان کو مظاہر قدرت کے سامنے جھکا دیا، وہ کیا چیز تھی جس نے اس سے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کرایا، وہ کیا تھا جس نے اس کو تلاطم خیز دریاؤں یا سر بفلک پہاڑوں کے سامنے سر نیاز خم کرنے پر مجبور کیا؟ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ ڈر ہے۔ ڈر تھا تو وہ بھاگ جاتے، چھپ جاتے لیکن اس کے بجائے انہوں نے ایک ایسی قوت کو مانا جو ازلی و ابدی ہے۔ موت سے ڈر تھا تو وہ مرنے سے ڈرتے لیکن انہیں روح کا خیال کس طرح پیدا ہوا خالق کائنات کا احساس تو ان بچوں تک میں پایا گیا جو الگ تھلگ رکھے گئے جنہیں کسی قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی اور نہ صرف بچوں میں بلکہ بہرے گونگوں نے بھی کسی خارجی امداد کے بغیر صرف اپنے وجدان کے مطالبے پر اس تصور کی تائید کی۔

انسان لاکھ سر مارے مگر وہ اس ساعت کو کبھی متعین نہیں کر سکتا جب اس کے اندر وجود خالق کے احساس نے جنم لیا تھا۔ یہ سب شواہد اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ یہ اعتقاد کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے اور خود بخود ہمارے نفس میں فطرت نے ودیعت کر رکھا ہے۔ اس بنا پر یہ عقیدہ کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں بلکہ یہ نفس الامری حقیقت ہے جس کو انسان بغیر کسی رد و کد کے تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ گویا یہ تصور انسان کی گھٹی میں داخل ہے۔ جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو توڑ نہیں سکتا اسی طرح ایمان باللہ سبحانہ ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے۔ روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید اپنے بلیغانہ انداز میں یوں پیش کرتا ہے:

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (ابراہیم : ۱۰)	کیا آسمان و زمین پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟
قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ	کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جو ہمارا اور تمہارا رب ہے؟

خدا کے وجود کا اعتراف چونکہ انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے اس لیے وحیٔ الٰہی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ	اپنا رُخ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر۔ یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

قرآن مجید اسی بدیہی حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر روزِ ازل کے اُس عہد و پیمان سے تعبیر کرتا ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا۔ یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوتے ہے اور ہزار انکار کے باوجود انسانی فکر و عمل کے بیشمار گوشوں میں اس کے اثرات جھلکتے نظر آتے ہیں،

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا (اعراف-۲۲)	اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی نسل کو نکالا تھا اور خود ان کے اُوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں، ہم گواہ ہیں۔

کلامِ الٰہی کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو اس طرزِ استدلال کے بیشمار نمونے ملیں گے۔ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں انسان کی اس فطری پکار کی طرف اشارہ نہ ملتا ہو۔ یہ دلیل سب سے قوی اور سب سے زیادہ مضبوط ہے کیونکہ یہ انسانی روح کا بنیادی تقاضا ہے۔

میں اپنی ہستی کے ثبوت کے لیے کسی منطقی دلیل کا محتاج نہیں۔ یہ ایسی معرفت طبعی ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔ آخر میری ہستی کا ثبوت میری معرفتِ طبعی سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر یہ معرفت میری عقلی اور اخلاقی فطرت کے لیے کافی نہیں تو پھر دنیا کا کوئی منطقی استدلال

اور کوئی دلیل کافی نہیں ہو سکتی۔

جب میں نے اس امر کو جان لیا کہ میں ہوں اور میں اپنی ہستی کا خود باعث نہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں کیسے یہاں آیا۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ میرے وجود کے پہلے اور اسباب تھے اور اُن سے پہلے اور، اور اُن سے پہلے اور۔ اگر وہ سبب ان کے بعد آیا جو میری تخلیق کا سبب نہیں تو میں بے سبب ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی ذات ایسی ہے جو ان اسباب کو ترتیب دیتی ہے۔ لہٰذا میری علتِ تخلیق کوئی اور ہے جو ان سب سے بالا ہے۔ یہ منطقی نتیجہ ہے اس بدیہی حقیقت کا کہ میں ہوں اور میں اس امر کو جانتا ہوں۔ جب میں موجود ہوں اور مجھے اپنے وجود کے بارے میں کوئی شک نہیں گزرتا تو پھر اپنے خالق و مالک کے وجود کے متعلق میں کیوں کسی شبہہ میں گرفتار ہوتا ہوں۔ اُس ذات باری تعالیٰ کا وجود بھی اسی طرح کی ایک ٹھوس حقیقت ہے جس طرح کہ "میں" اور یہ ساری کائنات جس میں میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ جب مخلوق کا وجود بغیر کسی شک کے ہمیں تسلیم ہے تو خالق کے وجود کا بھی ایک بدیہی حقیقت کے طور پر ہمیں اعتراف کرنا چاہیے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن مجید نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ۞ أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بَل لَّا يُوقِنُونَ (طور ۲۰)

کیا کسی اور چیز نے انہیں جامۂ خلقت عطا کیا ہے یا وہی اپنے آپ کے خالق ہیں، یا اُن ہی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں)، بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس فطری پکار کی طرف ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے بھی بحث کی ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب انسان خوشحال ہو، جب زندگی کے آلام و مصائب اُسے پریشان کر رہے ہوں تو اُس کی طبیعت میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کو اپنی قابلیت و استعداد پر محمول کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر انانیت کے جذبات بھی ابھرنے شروع ہوتے ہیں اور وہ اپنے مالک اور خالق سے ہر لحظہ دُور ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے

کہ میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ یہ ساری کائنات میرے وجود کی محتاج ہے۔ سب میرے سامنے دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہیں اور مجھے کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی ضرورت نہیں میں بالکل غیر مسئول ہوں، کوئی مجھ سے بازپرس کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے انسانی فطرت مسخ ہونا شروع ہوتی ہے اور اُس کے اندر اپنے مالک کو پہچاننے کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہتی۔

انسانی فطرت درحقیقت اُس وقت نکھر کر سامنے آتی ہے جب کسی انسان کی جان پر آ بنے، جب شدائد و مصائب اُس پر ہر طرف سے ہجوم کریں اور وہ ان کی یلغار کے سامنے بالکل بے بس ہو، جب عقل اپنی ساری چابکدستیوں کے باوجود قطعاً بیکار ثابت ہو رہی ہو۔ اس موقع پر انسان اپنے سارے حجابات دُور کر کے اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ پھر اُس کی انانیت بھی سرنگوں ہوتی ہے اور وہ اس بات کے لیے مضطرب ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو مالکِ حقیقی کے حوالے کر دے جو زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہے اور جس کی طرف رجوع کرنے کے بعد انسان سارے دنیاوی سہاروں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اَرَاَیْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَیْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ۔ (الانعام - ۴)

ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آجاتی ہے یا آخری گھڑی آپہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ بلکہ اُس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ انسان کی اس نفسیاتی کیفیت کو ایک دوسرے پیرایہ میں یوں بیان فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ

وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے

حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۔

(یونس - ۲)

چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے ۔

انسان کے دل میں یہ احساس کہ اس عالمِ مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظامِ کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام موجود ہے ۔ ہمارے دل میں ایک ہلکی سی لے کی طرح ہمیشہ موجود رہتا ہے ۔ بقول ڈاکٹر اشپر اگر کسی کے ہاں اس سے زلزلہ و طوفان اٹھتے ہیں، کسی کے اندر اس سے قلندرانہ وجد و حال پیدا ہوتا ہے ۔ کسی کے دل میں یہ اس خاموشی سے محوِ خواب ہوتا ہے کہ اسے اس کی گہرائی یا سطحیت کا شعور تک نہیں ہوتا ۔ لیکن ہر صورت میں اس کی موجودگی ایک امرِ واقعہ ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ خود اس

" دیکھے بھالے، بن سوجھے جانے پہچانے، بن بوجھے "

وجود کا احساس انسان کے نفس میں کیونکر ہوتا ہے ۔ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری ہر شعوری کیفیت کے لیے ایک معروض کا وجود ضروری ہے ۔ اگر غصہ آئے گا تو کسی بات یا شخص پر، اگر مسرت کی لہر دوڑے گی تو کسی چیز یا خیال سے، احترام کے جذبات موجزن ہونگے تو کسی شخص کے لیے غرضکہ ہر نفسی کیفیت کے لیے ایک معروض ضرور ہونا چاہیے ۔ یہ معروضات محسوس اشیا بھی ہو سکتی ہیں اور غیر محسوس اشیا بھی ۔ دونوں سے یکساں طور پر شعوری کیفیت تحریک پا سکتی ہے ۔ بسا اوقات مسرت کا خیال جس طرح ہمارے لیے تسکین کا باعث بنتا ہے خود مسرت نہیں بنتی ۔ ایمانی کیفیت کا معروض

اسی طرح کی ایک اَن دیکھی حقیقت ہے جس کا احساس دل کی گہرائیوں میں ہر وقت موجود رہتا ہے مگر ہم اُسے حواس کی گرفت میں نہیں لاسکتے اور انسان کی حالت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے

دل من داند، و من دانم و داند دل من

اس اَن دیکھے وجود کے احساس کی مثالیں ہمیں زندگی میں ہر طرف ملتی ہیں۔ خود ان لوگوں میں بھی جو ایمانی کیفیت پیدا کرنے کی کوئی خاص مشق یا کوشش نہیں کرتے، یہ احساس موجود رہتا ہے کہ کوئی علیم و خبیر ذات ہمیں دیکھ رہی ہے، کوئی قادرِ مطلق ہستی ہمارا احاطہ کیے ہوئے ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات دل کی انجان گہرائیوں میں اُبھرنے والے معصیت آلود خیالات اس چشم ہمہ بیں کے احساس سے دب جاتے ہیں جب کہ دنیاوی گرفت و مواخذہ کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ چور متاعِ غیر پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کانپ اٹھتا ہے اور اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی زبردست ہاتھ اُسے پکڑ کر اس فعل سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسی طرح جب انسان مصائب میں گرفتار ہو کر گھبرا اُٹھتا ہے اور ان کے چنگل سے نکلنے کی کوئی امید اسے نظر نہیں آتی تو وہ سہمے ہوئے بچے کی طرح لاشعوری طور پر اُس آغوش کی طرف لپکتا ہے جو رحمت سے لبریز ہے اور جہاں سے کبھی کوئی شخص ناکام و نامراد واپس نہیں گیا۔

اس اَن دیکھی ہستی سے کوئی شخص جتنا زیادہ تعلق پیدا کرے اُسی نسبت سے اُس کے لیے یہ ذات دیکھی بھالی، سمجھی بوجھی حقیقتوں سے زیادہ حقیقی چیز بن جاتی ہے اور صفاتِ الٰہی رحیمی و کریمی، جباریت و قہاریت عدل و احسان محض تصورات نہیں بلکہ محسوسات بن کر دنیا میں ہر طرف محیط نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ چیز بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن مجید نے صرف انسان کے اس وجدانی احساس کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس نے دلائل و براہین سے اس حقیقت کو ثابت بھی کیا ہے۔ اُس نے جہاں انسان کے اس جذبۂ فطرت کو ابھارا ہے کہ ایک ازلی و ابدی ذات اس کائنات کی خالق و مالک ہے اور اسی کی مشیت اور ارادہ سب پر حاوی ہے، وہاں اس نے اس امر کا بھی پورا پورا اہتمام

کیا ہے کہ یہ جذبہ خارجی اثرات سے دبنے نہ پائے اور اگر کبھی دب جائے تو غور و فکر کی قوت اسے مسلسل ابھارتی رہے اور اس طرح یہ زیرِ خاکستر آگ بھڑک کر انسان کے اندر ایمان کی حرارت اور یقین کا سوز پیدا کرے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انفس و آفاق میں ایسی نشانیاں رکھی ہیں جن سے ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود کی نہایت واضح شہادت فراہم ہوتی ہے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۔ (۷۵-۱۰)

انسان خواہ (ہزار) بہانے بناتا پھرے مگر وہ اپنے لیے خود دلیل ہے۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ (۴۱-۶)

ہم عنقریب اُن کو آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔ یہاں تک کہ اُن پر واضح ہو جائے کہ تحقیق حق یہی ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ذاریات-۱)

اور یقین کرنے والے کے لیے زمین میں اور خود تمہارے اپنے اندر نشانیاں ہیں، کیا تم نظر نہیں کرتے۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کے متعلق غور و فکر کے لیے ایک صحیح نقطۂ نظر کی نشاندہی بھی کردی ہے:

اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ، ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (سجدہ ۱-)

وہی (ذات پاک ہے) جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل ذلیل نچڑے پانی سے بنائی۔ پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیئے۔ تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

کائنات کے اس وسیع و پیچیدہ طلسم میں سب سے عجیب و غریب ہستی خود انسان ہے۔ مشتِ خاک سے اُس کی پیدائش کا آغاز، پھر ایک حقیر اور بے جان قطرۂ آب کے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اُس کے

جسم کا سڈول اور متناسب بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعتاً کہیں سے زندگی آجانا اور اس میں علم و حواس اور شعور و آگہی کی حیرت انگیز قوتیں اور صلاحیتیں پیدا ہو جانا سب خالق کے وجود کی زندہ شہادتیں ہیں۔

انسان کی ساخت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ وہ ناقابلِ احساس ذرات کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ کسی خالق و مالک کی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم تسلیم کرلیں کہ انسان کی پیدائش میں سوائے مادہ کے اور کسی ذات کا دخل نہیں تو پھر پہلے قدم پر ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادہ کی غیر معیّن توانائی کے بطن سے معیّن مظاہر کیسے پیدا ہو گئے۔ انسان کے جسم میں ایک حُسنِ ترتیب ہے جو کسی مرتّب کے ذوقِ جمال کی آئینہ دار ہے۔ مادہ کے اندھے بہرے لزوم سے تو یہ چیز قطعی طور پر ناممکن ہے۔ پھر انسانی جسم کے تمام اعضا میں ایک تناسب کی موجودگی اور مختلف خدمات کے لیے اُن کی اہلیت و استعداد، اس حقیقت کی غمازی کر رہی ہیں کہ اس کائنات میں شروع ہی سے ایک قوتِ ناظمہ اور قوتِ رابطہ موجود ہے جس نے مادہ کے مختلف ذرات کو باہم جوڑ کر انہیں ایک انسان کی شکل عطا کی۔ اور پھر اس انسان کے قطرۂ آب سے اس کی نسل کو آگے بڑھانے کا انتظام کیا اور اس میں بھی تعجب انگیز بات یہ ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف سانچوں میں ڈھالا۔ اگرچہ اعضا کے اعتبار سے سب انسان یکساں ہیں مگر ان اعضا کے مابین تناسب کا رشتہ ہر انسان میں الگ الگ پایا جاتا ہے جو اُسے دوسرے ابنائے جنس سے ممیز کرتا ہے۔ فطرت کی یہ ساری رنگا رنگی کسی گہری تدبیر کی شہادت دیتی ہے۔ اگر "انسان سازی" کے اس وسیع و عریض کارخانے کو صرف مادہ کا عمل سمجھ لیا جائے تو پھر فکری دلیل حیران ہے کہ بے منصوبہ عمل سے متناسب صورتیں کس طرح پیدا ہو گئیں، وحدت کثرت میں کس طرح جلوہ گر ہوئی۔ یہ سوالات ایسے ہیں جن کی آپ طبیعیات یا کیمیا سے توجیہ نہیں کر سکتے۔ ان کی صحیح توجیہ اس اصول کو تسلیم کرنے سے ہی ممکن ہے کہ "انسان سازی" کے یہ سارے کرشمے کسی عزمِ حیات کے مظاہر ہیں۔

انسانی ساخت سے آگے بڑھیے تو معاملہ اور بھی پیچیدہ معلوم ہوتا ہے جس کی کوئی توضیح طبیعیات کے

اصولِ موضوعہ سے ممکن نہیں۔ عناصر میں ظہورِ ترتیب سے انسانی شکل تو بن سکتی ہے مگر اُس میں شعور و آگہی کا پیدا ہونا ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ انسان بار بار سوچتا ہے کہ آخر مادہ کی اندھی قوت نے شعور و ادراک کو کیسے جنم دیا۔ شعور بے شعوری کا غلاف چاک کر کے کیونکر ظاہر ہو گیا۔ پھر خود یہ شعور اس توانائی سے کس قدر مختلف ہے جس سے وہ، کہا جاتا ہے، کہ پیدا ہوا ہے۔ یہ سب چیزیں بڑی ہی حیران کن ہیں اور سائنس ان کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکتی۔

بعض لوگ بڑی بیباکی سے یہ کہتے ہیں کہ ذہن و شعور مادہ کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے، لہٰذا وہ زندگی کے ارتقائی تغیرات کے لیے کسی بالاتر ذہن یا ذاتِ باری کی کارفرمائی کا یقین ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ اگر اس اصول کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان کائنات کے کارخانہ میں ایک عارضی اور اتفاقی شے ہے جو فطرت کی اندھی قوتوں کی تخلیق ہے۔ وہ فطرت کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا ہے جس سے وہ جس طرح چاہتی ہے کھیلتی رہتی ہے۔ اس میں کوئی عزم اور ارادہ نہیں، وہ مادہ کے تقیدات کا اسی طرح پابند ہے جس طرح کہ جمادات۔ وہ بیشک اپنے آپ کو فطرت کے مقاصد کا نگہبان خیال کرتے رہے مگر یہ محض اس کی ابلہ فریبی ہے۔ حقیقت میں اُس کا علم اور اُس کے عزائم فطرت ہی کے آفریدہ ہیں اور اس لحاظ سے اس کا مقدر بھی مادہ کے بے حس ذرات کی کارفرمائی کا بالکل فطری نتیجہ ہے۔ جب ہم اپنی تخلیق کی علتِ اولیٰ مادہ کو قرار دیتے ہیں تو پھر ہمیں بلا تامل یہ مان لینا چاہیے کہ ہم فطرت کی کرشمہ سازیوں کے غیر متعلق تماشائی ہیں۔

آپ اگر مادیین کے سامنے انسان کو اس بے بس حیثیت سے پیش کریں تو وہ فوراً کانوں پر ہاتھ رکھ لیں گے اور کہیں گے کہ انسان کو مجبورِ محض تو خدا کا تصور بناتا ہے، ہم تو اس کو بالکل خود مختار سمجھتے ہیں، مگر یہ صرف فریبِ نظر ہے۔ اُن کے ہاں عجیب و غریب الجھن یہ پیش آتی ہے کہ وہ اپنے مقدمات کی بنیاد تو بلا تکلف مادہ پر استوار کرتے ہیں مگر ان بنیادوں پر استدلال کی جو دیواریں اٹھائی جاتی ہیں اور

اُن پر افکار و نظریات کے جو محل تعمیر ہوتے ہیں انہیں یہ حضرات اپنانے پر کبھی تیار نہیں ہوتے۔ ان کی کج فہمی اور ہٹ دھرمی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک طرف تو وہ انسانی شعور کو محض سالمات کی کرشمہ سازی سمجھتے ہیں مگر دوسری طرف اس نظریہ کو کہ انسان مجبورِ محض ہے، جو در حقیقت اُن کے اپنے مقدمات کا ہی نتیجہ ہے، کبھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور اس کے برعکس اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ شعور جس کی پیدائش صرف سالمات کے ہاتھوں سے ہوئی ہے وہ عالمِ طبیعی اور اس کی قوتوں پر اپنے تصورات عائد کرتا ہے جو قوانین کہلاتے ہیں اور پھر اُس کی مدد سے اُسی فطرت کو مسخر کرتا ہے جس کی وہ خود نہ صرف پیداوار ہے بلکہ جس کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی ہے اور اپنے فکر و عمل کو اسی کے اشارۂ ابرو سے معین کرنے پر مجبور رہے۔

یہ وہ مقام ہے جس پر قرآنِ حکیم ہمیں انسان کی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کو بے جان اور بے حس مادّہ پیدا نہیں کر سکتا بلکہ یہ کسی مدبّر کی تدبیر کی رہینِ منت ہے۔ جس نے ایک خاص منصوبہ کے تحت اس کے مختلف اعضاء کے درمیان تناسب پیدا کیا اور انہیں اہلیت کے اعتبار سے مختلف فرائض سونپے۔ پھر اسی ذات نے کیلسیم، لوہے، کاربن کے اس پیکر میں زندگی پیدا کی اور اس طرح اُسے سرگرمِ عمل کیا۔ اس کے بعد اُس نے اُس کے اندر ذہن و شعور کی شمع جلائی تاکہ وہ خالق کائنات کی آیات کو بنظرِ امعان دیکھے۔ کانوں سے اس کے احکام کو توجہ و شوق سے سنے، دل سے انہیں ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر اپنے مالک کو پہچان کر اُس کا شکر بجا لائے۔

آئیے اب ایک نظر اُن آیات پر بھی ڈال لیں جن میں انسان کو آفاق پر غور کرنے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ فطرت کے جمال میں ہی حسنِ ازل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی پکار پکار کر انسان کو ایک خالق کے وجود کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ سورج کی خشمگیں کرنوں میں نسیمِ سحر

کے جھونکوں میں، چاند کی ٹھنڈک میں، صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں اُسے آیاتِ الٰہی نظر آتی ہیں۔ وہ یہ باور ہی نہیں کر سکتا کہ یہ ساری کائنات جو اتنی منظم ہے، جس کے رنگارنگ مظاہر میں ایک نہایت گہرا رشتہ موجود ہے، بغیر کسی خالق اکبر کے پیدا ہو گئی ہے۔ یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں کروڑوں جاندار اور بے جان اشیا، یہ علل و اسباب کا غیر منقطع تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا حیرت انگیز نظام قدم قدم پر اپنی کرشمہ زائیوں سے انسان کے دامنِ دل کو کھینچتا ہے اور انسان بالکل بے اختیار ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

مناظرِ فطرت کی ان روشن آیات کے متعلق یہ احساس ہر زمانے کے ادب میں نہایت عمدہ جواہر پاروں میں ملتا ہے۔ سعدی اس احساس کی ترجمانی میں یوں نغمہ سرا ہوا ہے:۔

برگِ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتر لیست معرفت کردگار

ربو (RIBOT) نے اپنی کتاب "نفسیات جذبات" میں افریقہ کے ایک وحشی کے مذہبی خیالات نقل کیے ہیں۔ آپ ان احساسات کو ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ یہ فطرت سے کس قدر قریب ہیں:

"بارہ برس کا ذکر ہے کہ میں اپنا گلہ چرانے کے لیے گیا، دھند لکا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ میں ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور اپنے دل سے غم انگیز سوالات پوچھنے لگا۔ غم انگیز اس وجہ سے کہ میں ان کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ ستاروں کو کس نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے؟ آسمان کس ستون پر قائم ہے۔ دریا کے پانی کو دیکھو کہ کبھی نہیں تھمتا ہے ہی چلا جاتا ہے صبح سے شام اور شام سے صبح تک بس اس کا یہی کام ہے؟ آخر یہ کہاں جا کر رکتا ہے اور اسے کون بہا رہا ہے۔ بادلوں ہی کو دیکھو کہ آتے جاتے رہتے ہیں، کبھی کبھی پانی برسا جاتے ہیں۔ آخر وہ کہاں سے آتے ہیں۔ انہیں کون بھیجتا ہے؟ ہمارے بجاری تو پانی برسا نہیں سکتے اس لیے کہ میں نے کبھی انہیں آسمان پر جاتے ہوئے نہیں دیکھا، پھر آخر کون برساتا ہے۔ میں ہوا

کو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن آخر وہ کیا چیز ہے، اُسے کون چلاتا ہے؟ ان سوالات کا جواب دل سے نہ پاکر میں نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔"

اسرارِ کائنات کے متعلق عقل وخرد کی یہ بے چینی جو آگے چل کر عقیدے اور ایمان پر منتج ہوتی ہے صرف افریقہ کے اس وحشی ہی تک محدود نہیں بلکہ یہ انسان کی ایک فطری خلش ہے جسے دُور کرنے کے لیے ہر آدمی مضطرب اور پریشان رہتا ہے۔ ہمارے ملک کا مایۂ ناز شاعر جسے زندگی میں غمِ دوراں سے کم ہی فرصت نصیب ہوئی، وہ بھی فرطِ حیرت سے پوچھتا ہے:

لالہ و گل کہاں سے آتے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

یہ خیال فکر و احساس رکھنے والے انسان کا ایک بالکل فطری سوال ہے اور اس سوال ہی کی بدولت انسان کو حقیقت کی طرف صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اُسے اگر اس کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا تو وہ "لاادری" کہہ کر چپ ہو جاتا ہے جو خود اثبات واجب الوجود کی ایک سلبی شکل ہی ہے

سمجھا ہے پرے تجھ کو اِدراک کی سرحد سے
جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

اسی نوعیت کا ایک تاثر صاحبِ ہدایہ نے اپنی کتاب "تعلیم المتعلم" میں قلمبند فرمایا ہے۔ علامہ رحمہ اللہ تعلیم و تدریس کے فطری اصولوں پر گفتگو کرتے ہوئے ایک فلسفی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ منطقی طرزِ استدلال کے ذریعہ وجودِ باری تعالیٰ کا کھوج لگانے سے جب اکتا گیا تو آشفتہ سر ہو کر صحرا کی جانب نکل گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدا کو آخر حکما اور فلاسفہ ہی تو نہیں مانتے اس کی ذات پر وہ لوگ بھی ایمان رکھتے ہیں جنہیں زندگی میں کبھی بھی رسمی تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر نہیں آتا۔ ایسے افراد اس ذات کے وجود کے لیے کیا دلائل پیش کرتے ہونگے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنی دیر میں اس کے پاس سے ایک گڈریا گزرا فلسفی نے اُسے روک لیا اور پوچھا "کیا تم خدا کو مانتے ہو" گڈریے نے جواب دیا "بے شک"

فلسفی نے دریافت کیا: "اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟" اس پر گڈریے نے اپنی بدویانہ زبان میں یہ کہا:

اَلْبَعْرُ یَدُلُّ عَلَی الْبَعِیْرِ وَالْاَثَرُ یَدُلُّ عَلَی الْمَسِیْرِ فَالْاَرْضُ ذَاتُ فِجَاجٍ وَالسَّمَآءُ ذَاتُ بُرُوْجٍ اَفَلَا تَدُلُّ عَلَی الْعَلِیِّ الْقَدِیْرِ؟	اونٹ کی مینگنیاں ہوں تو پتہ چل جاتا ہے کہ اونٹ گزرا ہے نقوشِ پا راہ نورد کا پتہ دیتے ہیں۔ تو اب کیا یہ کشادہ راستوں والی زمین اور یہ برجوں والا آسمان ایک برتر و قادر ذات کی شہادت نہیں دیتے؟

گڈریے کے ان الفاظ میں ہر شخص خالقِ کائنات کے بارے میں انسان کے فطری سوال کا فطری جواب دیکھ سکتا ہے۔ ان میں ایک ایسی حکمت اور دانائی موجود ہے جس پر ہر سلیم الفطرت انسان کا دل خود گواہی دیتا ہے۔

قرآن مجید اسی طرزِ استدلال سے انسان کو حقیقت تک پہنچاتا ہے۔ وہ اسے بار بار اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ اس کائنات میں پھیلی ہوئی آیاتِ الٰہی پر غور کرے تاکہ وہ ایک صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوشمندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت پر غور و فکر کرتے ہیں۔

یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالقِ کل کا پتہ دیتا ہے اور انہیں دیکھ کر ہر شخص بآسانی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ خدا سے غافل نہ ہو اور آثارِ کائنات کو جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ غور و فکر کے ساتھ مشاہدہ کرے۔ (باقی صفحہ ۹۲ پر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تفہیم القرآن

القصص

نام | آیت نمبر ۲۵ کے اس فقرے سے ماخوذ ہے: وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ یعنی وہ سورہ جس میں القصص کا لفظ آیا ہے۔ لغت کے اعتبار سے قصص کے معنی ترتیب وار واقعات بیان کرنے کے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ لفظ باعتبار معنی بھی اس سورے کا عنوان ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں حضرت موسیٰ کا مفصل قصہ بیان ہوا ہے۔

زمانۂ نزول | سورۂ نمل کی تمہید میں ابن عباس اور جابر بن زید کا یہ قول گزر چکا ہے کہ سورۂ شعراء، سورۂ نمل اور سورۂ قصص یکے بعد دیگرے نازل ہوئی ہیں۔ زبان، انداز بیان اور مضامین سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان تینوں سورتوں کا زمانۂ نزول قریب قریب ایک ہی ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی ان تینوں میں قریبی تعلق ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے مختلف اجزاء جو ان میں بیان کیے گئے ہیں وہ باہم مل کر ایک پورا قصہ بن جاتے ہیں۔ سورۂ شعراء میں نبوت کا منصب قبول کرنے سے معذرت کرتے ہوئے حضرت موسیٰ عرض کرتے ہیں کہ "قوم فرعون کا ایک جرم میرے ذمہ ہے جس کی وجہ سے میں ڈرتا ہوں کہ وہاں جاؤں گا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے"۔ پھر جب حضرت موسیٰ فرعون کے ہاں تشریف لے جاتے ہیں تو وہ کہتا ہے "کیا ہم نے اپنے ہاں تجھے بچہ سا نہیں پالا تھا، اور تو ہمارے ہاں چند سال رہا پھر کر گیا کچھ جو کہ کر گیا"۔ ان دونوں باتوں کی کوئی تفصیل وہاں نہیں بیان کی گئی۔ اس سورے میں اسے تفصیل بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۂ نمل میں قصہ یکایک اس بات سے شروع ہو گیا ہے کہ حضرت موسیٰ اپنے اہل و عیال کو لیکر جا رہے تھے۔

یکایک انہوں نے ایک آگ دیکھی۔ وہاں اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی کہ یہ کیسا سفر تھا، کہاں سے وہ آرہے تھے اور کدھر جا رہے تھے۔ یہ تفصیل اس سورے میں بیان ہوئی ہے۔ اس طرح یہ تینوں سورتیں مل کر قصۂ موسیٰ علیہ السلام کی تکمیل کر دیتی ہیں۔

موضوع اور مباحث | اس کا موضوع ان شبہات و اعتراضات کو رفع کرنا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر وارد کیے جا رہے تھے، اور اُن عذرات کو قطع کرنا ہے جو آپ پر ایمان نہ لانے کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔

اس غرض کے لیے سب سے پہلے حضرت موسیٰ کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو زمانۂ نزول کے حالات سے مل کر خود بخود چند حقیقتیں سامع کے ذہن نشین کر دیتا ہے:

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے وہ غیر محسوس طریقے سے اسباب و ذرائع فراہم کر دیتا ہے۔ جس بچے کے ہاتھوں آخر کار فرعون کا تختہ الٹنا تھا، اسے اللہ نے خود فرعون ہی کے گھر میں اس کے اپنے ہاتھوں پرورش کرا دیا اور فرعون یہ نہ جان سکا کہ وہ کسے پرورش کر رہا ہے۔ اس خدا کی مشیت سے کون لڑ سکتا ہے اور کس کی چالیں اس کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ نبوت کسی شخص کو کسی بڑے جشن اور زمین و آسمان سے کسی بھاری اعلان کے ساتھ نہیں دی جاتی۔ تم کو حیرت ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چپکے سے یہ نبوت کہاں سے مل گئی اور بیٹھے بٹھائے یہ نبی کیسے بن گئے۔ مگر جن موسیٰ (علیہ السلام) کا تم خود حوالہ دیتے ہو کہ لَوْلَآ اُوْتِیَ مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی (آیت ۴۸)، اسے بھی اسی طرح راہ چلتے نبوت مل گئی تھی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی تھی کہ آج طور سینا کی سنسان وادی میں کیا واقعہ پیش آگیا۔ موسیٰ خود ایک لمحے پہلے تک نہ جانتے تھے کہ انہیں کیا چیز ملنے والی ہے۔ آگ لینے چلے تھے اور پیمبری مل گئی۔

تیسرے یہ کہ جس بندے سے خدا کوئی کام لینا چاہتا ہے وہ بغیر کسی لاؤ لشکر اور

سرو سامان کے اٹھتا ہے، کوئی اس کا مددگار نہیں ہوتا، کوئی طاقت بظاہر اس کے پاس نہیں ہوتی، مگر بڑے بڑے لاؤ لشکر اور سرو سامان والے آخر کار اس کے مقابلے میں دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ جو نسبت آج تم اپنے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان پا رہے ہو اس سے بہت زیادہ فرق موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کی طاقت کے درمیان تھا۔ مگر دیکھ لو کہ آخر کار کون جیتا اور کون ہارا۔

چوتھے یہ کہ تم لوگ بار بار موسیٰ کا حوالہ دیتے ہو کہ "محمدؐ کو وہ کچھ کیوں نہ دیا گیا جو موسیٰ کو دیا گیا تھا" یعنی عصا اور ید بیضا اور دوسرے کھلے کھلے معجزے۔ گویا تم ایمان لانے کو تو تیار بیٹھے ہو، بس انتظار ہے تو یہ کہ تمہیں وہ معجزے دکھائے جائیں جو موسیٰ نے فرعون کو دکھائے تھے۔ مگر تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ جن لوگوں کو وہ معجزے دکھائے گئے تھے انہوں نے کیا کیا تھا؟ وہ انہیں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے، انہوں نے کہا تو یہ کہا کہ یہ جادو ہے۔ کیونکہ وہ حق کے خلاف ہٹ دھرمی اور عناد میں مبتلا تھے۔ اسی مرض میں آج تم مبتلا ہو۔ کیا تم اسی طرح کے معجزے دیکھ کر ایمان لے آؤ گے؟ پھر تمہیں کچھ یہ بھی خبر ہے کہ جن لوگوں نے وہ معجزے دیکھ کر حق کا انکار کیا تھا ان کا انجام کیا ہوا؟ آخر کار اللہ نے انہیں تباہ کر کے چھوڑا۔ اب کیا تم بھی ہٹ دھرمی کے ساتھ معجزہ مانگ کے اپنی شامت بلانا چاہتے ہو؟

یہ وہ باتیں ہیں جو کسی تصریح کے بغیر آپ سے آپ ہر اس شخص کے ذہن میں اتر جاتی تھیں جو مکے کے کافرانہ ماحول میں اس قصے کو سنتا تھا، کیونکہ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار مکہ کے درمیان ویسی ہی ایک کشمکش برپا تھی جیسی اس سے پہلے فرعون اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان برپا ہو چکی تھی، اور ان حالات میں یہ قصہ سنانے کے معنی یہ تھے کہ اس کا ہر ہر جز وقت کے حالات پر خود بخود چسپاں ہوتا چلا جائے، خواہ ایک لفظ بھی ایسا نہ کہا جائے جس سے معلوم ہو کہ قصے کا کون سا جز اس وقت کے کس

معاملے پر چسپاں ہو رہا ہے۔

اس کے بعد پانچویں رکوع سے اصل موضوع پر براہِ راست کلام شروع ہوتا ہے پہلے اِس بات کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ثبوت قرار دیا جاتا ہے کہ آپ اُمّی ہونے کے باوجود دو ہزار برس پہلے گزرا ہوا ایک تاریخی واقعہ اس تفصیل کے ساتھ من وعن سنا رہے ہیں، حالانکہ آپ کے شہر اور آپ کی برادری کے لوگ خوب جانتے تھے کہ آپ کے پاس ان معلومات کے حاصل ہونے کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس کی وہ نشان دہی کر سکیں۔

پھر آپ کے نبی بنائے جانے کو ان لوگوں کے حق میں اللہ کی ایک رحمت قرار دیا جاتا ہے کہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے اور اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے یہ انتظام کیا

پھر ان کے اِس اعتراض کا جواب دیا جاتا ہے جو وہ بار بار پیش کرتے تھے کہ "یہ نبی وہ معجزے کیوں نہ لایا جو اس سے پہلے موسیٰ لائے تھے" ان سے کہا جاتا ہے کہ موسیٰ جن کے متعلق تم خود مان رہے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے معجزے لائے تھے، انہی کو تم نے کب مانا ہے کہ اب اس نبی سے معجزے کا مطالبہ کرتے ہو؟ خواہشاتِ نفس کی بندگی نہ کرو تو حق اب بھی تمہیں نظر آ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس مرض میں تم مبتلا رہو تو خواہ کوئی معجزہ آجائے، تمہاری آنکھیں نہیں کھل سکتیں۔

پھر کفارِ مکہ کو اُس واقعہ پر عبرت اور شرم دلائی گئی ہے جو اُسی زمانے میں پیش آیا تھا کہ باہر سے کچھ عیسائی مکہ آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سُن کر ایمان لے آئے مگر مکہ کے لوگ اپنے گھر کی اس نعمت سے مستفید تو کیا ہوتے، ان کے ابوجہل نے اُلٹی اُن لوگوں کی کھلم کھلا بے عزتی کی۔

آخر میں کفارِ مکہ کے اُس اصل عذر کو لیا جاتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ ماننے کے لیے وہ پیش کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر ہم اہلِ عرب کے دینِ شرک کو

چھوڑ کر اس نئے دینِ توحید کو قبول کریں تو یکایک اس ملک سے ہماری مذہبی، سیاسی اور معاشی چودھراہٹ ختم ہو جائے گی اور ہمارا حال یہ ہو گا کہ عرب کے سب سے زیادہ با اثر قبیلے کی حیثیت کھو کر اس سرزمین میں ہمارے لیے کوئی جائے پناہ تک باقی نہ رہے گی یہ چونکہ سردارانِ قریش کی حق دشمنی کا اصل محرک تھا اور باقی سارے شبہات و اعتراضات محض بہانے تھے جو وہ عوام کو فریب دینے کے لیے تراشتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر آخر سورۃ تک مفصل کلام فرمایا ہے اور اس کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈال کر نہایت حکیمانہ طریقے سے اُن تمام بنیادی امراض کا مداوا کیا ہے جن کی وجہ سے یہ لوگ حق اور باطل کا فیصلہ دنیوی مفاد کے نقطۂ نظر سے کرتے تھے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے

طٰسٓمٓ۔ یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں۔ ہم موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک تمہیں سناتے ہیں[۱]، ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے جو ایمان لائیں[۲]۔

واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی[۳] اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم

---

[۱] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو البقرہ (رکوع ۶)۔ الاعراف (رکوع ۱۳ تا ۱۶)۔ یونس (رکوع ۸-۹)۔ ہود (رکوع ۹)۔ بنی اسرائیل (رکوع ۱۲)۔ مریم (رکوع ۴)۔ طٰہٰ (رکوع ۱-۴)۔ المومنون (رکوع ۳)۔ الشعراء (رکوع ۲-۴)۔ النمل (رکوع ۱)۔ العنکبوت (رکوع ۴)۔ المومن (رکوع ۳-۵)۔ الزخرف (رکوع ۵)۔ الدخان (رکوع ۱)۔ الذاریات (رکوع ۲)۔ النازعات (رکوع ۱)۔

[۲] یعنی جو لوگ بات ماننے کے لیے تیار ہی نہ ہوں ان کو سنانا تو بے کار ہے۔ البتہ جنہوں نے ہٹ دھرمی کا قفل اپنے دلوں پر چڑھا نہ رکھا ہو وہ اس گفتگو کے مخاطب ہیں۔

[۳] اصل میں لفظ عَلَا فِی الْاَرْضِ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے زمین میں سر اٹھایا باغیانہ روش اختیار کی، اپنی اصل حیثیت یعنی بندگی کے مقام سے اٹھ کر خود مختاری اور خداوندی کا روپ

کر دیا۔[۶] ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔[۷] وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔ اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان

دھار لیا، ماتحت ہونے کے بجائے بالا دست بن بیٹھا، اور جبار متکبر بن کر ظلم ڈھانے لگا۔

[۶] یعنی اس کی حکومت کا قاعدہ یہ نہ تھا کہ قانون کی نگاہ میں ملک کے سب باشندے یکساں ہوں اور سب کو برابر کے حقوق دیئے جائیں، بلکہ اس نے تمدن و سیاست کا یہ طرز اختیار کیا کہ ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جائے، کسی کو مراعات و امتیازات دے کر حکمران گروہ ٹھہرایا جائے اور کسی کو محکوم بنا کر دبایا اور پیسا اور لوٹا جائے۔

یہاں کسی کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ اسلامی حکومت بھی تو مسلم اور ذمی کے درمیان تفریق کرتی ہے اور ان کے حقوق و اختیارات ہر حیثیت سے یکساں نہیں رکھتی۔ یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ اس فرق و امتیاز کی بنیاد فرعونی تفریق کے برعکس نسل، رنگ، زبان، یا طبقاتی امتیاز پر نہیں ہے بلکہ اصول اور مسلک کے اختلاف پر ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت میں ذمیوں اور مسلمانوں کے درمیان قانونی حقوق میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے، تمام تر فرق صرف سیاسی حقوق میں ہے۔ اور اس فرق کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک اصولی حکومت میں حکمران جماعت صرف وہی ہو سکتی ہے جو حکومت کے بنیادی اصولوں کی حامی ہو۔ اس جماعت میں ہر وہ شخص داخل ہو سکتا ہے جو اس کے اصولوں کو مان لے، اور ہر وہ شخص اس سے خارج ہو جاتا ہے جو ان اصولوں کا منکر ہو جائے۔ آخر اس تفریق میں اور اُس فرعونی طرزِ تفریق میں کیا وجہ مشابہت ہے جس کی بنا پر محکوم گروہ کا کوئی فرد کبھی حکمران گروہ میں شامل نہیں ہو سکتا جس میں محکوم گروہ کو سیاسی اور قانونی حقوق تو درکنار بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل نہیں ہوتے، حتیٰ کہ زندہ رہنے کا حق بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے جس میں محکوموں کے لیے کسی حق کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوتی، تمام فوائد و منافع اور حسنات و درجات صرف حکمران قوم کے لیے مختص ہوتے ہیں، اور یہ مخصوص حقوق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں جو حکمران قوم میں پیدا ہو جائے۔

[۷] بائیبل میں اس کی جو تشریح ملتی ہے وہ یہ ہے:

"تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسف کو نہیں جانتا تھا۔ اور اس نے اپنی قوم

لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں۔

کے لوگوں سے کہا کہ دیکھو اسرائیلی ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں سو آؤ ہم ان کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں ایسا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔ اس لیے انہوں نے ان پر بیگار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے کر انہیں ستائیں۔ سو انہوں نے فرعون کے لیے ذخیرے کے شہر پتوم اور رعمسیس بنائے ... اور مصریوں نے بنی اسرائیل پر تشدد کر کے ان سے کام کروایا اور انہوں نے ان سے سخت محنت سے گارا اور اینٹ بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے کر ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی سب خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے تشدد کی تھیں .... تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائیوں سے ... باتیں کیں اور کہا کہ جب عبرانی (یعنی اسرائیلی) عورتوں کے تم بچہ جناؤ اور ان کو پتھر کی بیٹھکوں پر بیٹھی دیکھو تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا اور اگر بیٹی ہو تو وہ جیتی رہے۔" (خروج، باب ۱۔ آیت ۸-۱۶)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا دور گزر جانے کے بعد مصر میں ایک قوم پرستانہ انقلاب ہوا تھا اور قبطیوں کے ہاتھ میں جب دوبارہ اقتدار آیا تو نئی قوم پرست حکومت نے بنی اسرائیل کا زور توڑنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس سلسلے میں صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا گیا کہ اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کیا جاتا اور انہیں ادنیٰ درجے کی خدمات کے لیے مخصوص کر لیا جاتا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ بنی اسرائیل کی تعداد گھٹائی جائے اور ان کے لڑکوں کو قتل کر کے صرف ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے تاکہ رفتہ رفتہ ان کی عورتیں قبطیوں کے تصرف میں آتی جائیں اور ان سے اسرائیل کے بجائے قبطی نسل پیدا ہو۔ تلمود اس کی مزید تفصیل یہ دیتی ہے کہ حضرت یوسف کی وفات پر ایک صدی سے کچھ زیادہ مدت گزر جانے کے بعد یہ انقلاب ہوا تھا۔ وہ بتاتی ہے کہ نئی قوم پرست حکومت نے پہلے تو بنی اسرائیل کو ان کی زرخیز زمینوں اور ان کے مکانات اور جائدادوں سے محروم کیا۔ پھر انہیں حکومت کے تمام مناصب سے

اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون و ہامانؔ اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلا

یے دخیل کیا۔ اس کے بعد بھی جب قبطی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل اور ان کے ہم مذہب مصری کافی طاقت ہیں تو انہوں نے اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کرنا شروع کیا اور ان سے سخت محنت کے کام قلیل معاوضوں پر یا بلا معاوضہ لینے لگے۔ یہ تفسیر ہے قرآن کے اس بیان کی کہ مصر کی آبادی کے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا۔ اور سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ آلِ فرعون بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیتے تھے (يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ)۔

مگر بائیبل اور قرآن دونوں اس ذکر سے خالی ہیں کہ فرعون سے کسی نجومی نے یہ کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جس کے ہاتھوں فرعونی اقتدار کا تختہ الٹ جائے گا اور اسی خطرے کو روکنے کے لیے فرعون نے اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ یا فرعون نے کوئی خوفناک خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر یہ دی گئی تھی کہ ایک لڑکا بنی اسرائیل میں ایسا اور ایسا پیدا ہونے والا ہے۔ یہ افسانہ تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے ہمارے مفسرین نے نقل کیا ہے (ملاحظہ ہو جیوش انسائیکلوپیڈیا، مضمون "موسیٰ" اور THE TALMUD SELECTION صفحہ ۱۲۳-۱۲۴)

۷؎ یعنی انہیں دنیا میں قیادت و رہنمائی کا مقام عطا کریں۔

۸؎ یعنی ان کو زمین کی وراثت بخشیں اور وہ حکمران و فرمانروا ہوں۔

۹؎ مغربی مستشرقین نے اس بات پر بڑی لے دے کی ہے کہ ہامان تو ایران کے بادشاہ اخسویرس (XERXES) کے دربار کا ایک امیر تھا، اور اس بادشاہ کا زمانہ حضرت موسیٰ کے سینکڑوں برس بعد ۴۸۶ء اور ۴۶۵ء قبل مسیح میں گزرا ہے، مگر قرآن نے اسے مصر لے جا کر فرعون کا وزیر بنا دیا۔ لیکن اگر تعصب کا پردہ ان لوگوں کی عقل پر پڑا ہوا نہ ہو تو وہ خود غور کریں کہ آخر ان کے پاس یہ یقین کرنے کے لیے کیا تاریخی ثبوت موجود ہے کہ اخسویرس کے درباری ہامان سے پہلے دنیا میں کوئی شخص کبھی اس نام کا نہیں گزرا ہے۔ جس فرعون کا ذکر یہاں ہو رہا ہے اگر اس کے تمام وزرا اور امراء اور اہلِ دربار کی کوئی مکمل فہرست بالکل مستند ذریعے سے کسی مستشرق صاحب کو مل گئی ہے جس میں ہامان کا نام مفقود ہے تو وہ اسے چھپائے کیوں بیٹھے ہیں۔ انہیں اس کا فوٹو فوراً شائع کر دینا

دیں جس کا انہیں ڈر تھا۔

ہم نے موسیٰ کی ماں کو اشارہ کیا کہ "اس کو دودھ پلا، پھر جب تجھے اُس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف اور غم نہ کر، ہم اسے تیرے ہی پاس واپس لے آئیں گے اور اس کو پیغمبروں میں شامل کریں گے۔" آخر کار فرعون کے گھر والوں نے اسے نکال لیا تاکہ وہ

چاہیے، کیونکہ قرآن کی تکذیب کے لیے اس سے زیادہ مؤثر ہتھیار انہیں کوئی اور نہ ملے گا۔

۹ بیچ میں یہ ذکر چھوڑ دیا گیا ہے کہ انہی حالات میں ایک اسرائیلی والدین کے ہاں وہ بچہ پیدا ہو گیا جس کو دنیا نے موسیٰ علیہ السلام کے نام سے جانا۔ بائیبل اور تلمود کے بیان کے مطابق یہ خاندان حضرت یعقوب کے بیٹے لاوی کی اولاد میں سے تھا۔ حضرت موسیٰ کے والد کا نام ان دونوں کتابوں میں عمرام بتایا گیا ہے، قرآن اسی کا تلفظ عمران کرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ان کے ہاں دو بچے ہو چکے تھے۔ سب سے بڑی لڑکی مریم (MIRIAM) نامی تھیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ ان سے چھوٹے حضرت ہارون تھے۔ غالباً یہ فیصلہ کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو بیٹا پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے، اُن کی پیدائش کے زمانے میں نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ بچ گئے۔ پھر یہ قانون جاری ہوا اور اس خوفناک زمانے میں تیسرے بچے کی پیدائش ہوئی۔

۱۰ یعنی پیدا ہوتے ہی دریا میں ڈال دینے کا حکم نہ تھا، بلکہ ارشاد یہ ہوا کہ جب تک خطرہ نہ ہو بچے کو دودھ پلاتی رہو۔ جب راز فاش ہوتا نظر آنے اور اندیشہ ہو کہ بچے کی آواز سن کر یا اور کسی طرح دشمنوں کو اس کی پیدائش کا علم ہو جائے گا، یا خود بنی اسرائیل ہی میں سے کوئی کمینہ آدمی مخبری کر بیٹھے گا، تو بے خوف و خطر اسے ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈال دینا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ پیدائش کے بعد تین مہینے تک حضرت موسیٰ کی والدہ ان کو چھپائے رہیں۔ تلمود اس پر اتنا اضافہ کرتی ہے کہ فرعون کی حکومت نے اس زمانے میں جاسوس عورتیں چھوڑ رکھی تھیں جو اسرائیلی گھروں میں اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے لے جاتی تھیں اور وہاں کسی نہ کسی طرح ان بچوں کو رُلا دیتی تھیں تاکہ اگر کسی اسرائیلی نے اپنے ہاں کوئی بچہ چھپا رکھا ہو تو وہ بھی دوسرے بچے کی آواز سن کر رونے لگے۔ اس نئے طرز جاسوسی سے حضرت موسیٰ کی والدہ پریشان ہو گئیں اور انہوں نے اپنے بچے کی جان بچانے کے لیے پیدائش کے تین مہینے بعد اسے دریا میں ڈال دیا۔ اس حد تک ان دونوں کتابوں کا بیان قرآن

ان کا دشمن اور ان کے لیے سببِ رنج بنے،[۱۱] واقعی فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر (اپنی تدبیر میں)، بڑے غلط کار تھے۔ فرعون کی بیوی نے (اس سے) کہا "یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو، یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں"[۱۲] اور وہ (انجام سے) بے خبر تھے۔

کے مطابق ہے۔ اور دریا میں ڈالنے کی کیفیت بھی انہوں نے وہی بتائی ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے اِقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ "بچے کو ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈال دے"۔ اسی کی تائید بائیبل اور تلمود بھی کرتی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ کی والدہ نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور اسے چکنی مٹی اور رال سے لیپ کر پانی سے محفوظ کر دیا۔ پھر اس میں حضرت موسیٰ کو لٹا کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔ لیکن سب سے بڑی بات جو قرآن میں بیان کی گئی ہے اس کا کوئی ذکر اسرائیلی روایات میں نہیں ہے، یعنی یہ کہ حضرت موسیٰ کی والدہ نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ اس طریقے پر عمل کرنے میں نہ صرف یہ کہ تمہارے بچے کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے، بلکہ ہم بچے کو تمہارے پاس ہی پلٹا لائیں گے، اور یہ کہ تمہارا یہ بچہ آگے چل کر ہمارا رسول ہونے والا ہے۔

[۱۱] یہ اُن کا مقصد نہ تھا بلکہ یہ اُن کے اس فعل کا انجام مقدر تھا۔ وہ اس بچے کو اٹھا رہے تھے جس کے ہاتھوں آخر کار انہیں تباہ ہونا تھا۔

[۱۲] اس بیان سے جو صورتِ معاملہ صاف سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ تابوت یا ٹوکرا دریا میں بہتا ہوا جب اس مقام پر پہنچا جہاں فرعون کے محلات تھے، تو فرعون کے خدام نے اسے پکڑ لیا اور لے جا کر بادشاہ اور ملکہ کے سامنے پیش کر دیا۔ ممکن ہے کہ بادشاہ اور ملکہ خود اس وقت دریا کے کنارے سیر میں مشغول ہوں اور ان کی نگاہ اس ٹوکرے پر پڑی ہو اور انہی کے حکم سے وہ نکالا گیا ہو۔ اس میں ایک بچہ پڑا ہوا دیکھ کر بآسانی یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ ضرور کسی اسرائیلی کا بچہ ہے، کیونکہ وہ ان محلوں کی طرف سے آرہا تھا جن میں بنی اسرائیل رہتے تھے، اور انہی کے بیٹے اس زمانے میں قتل کیے جا رہے تھے، اور انہی کے متعلق یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ کسی نے بچے کو چھپا کر کچھ مدت تک پالا ہے اور پھر جب زیادہ دیر چھپ

اُدھر موسیٰ کی ماں کا دل اُڑا جا رہا تھا۔ وہ اس کا راز فاش کر بیٹھتی۔ اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھا دیتے تاکہ وہ (ہمارے وعدے پر) ایمان لانے والوں میں سے ہو۔ اُس نے بچے کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جا۔ چنانچہ وہ الگ سے اس کو اس طرح دیکھتی رہی کہ (دشمنوں کو) اس کا پتہ نہ چلا[۱۴]۔ اور

نہ سکا تو اب اسے اس امید پر دریا میں ڈال دیا ہے کہ شاید اسی طرح اس کی جان بچ جائے اور کوئی اسے نکال کر پال لے۔ اسی بنا پر کچھ ضرورت سے زیادہ وفادار غلاموں نے عرض کیا کہ حضور اسے فوراً قتل کرادیں، یہ بھی کوئی بچہ اُنھی کا ہے۔ لیکن فرعون کی بیوی آخر عورت تھی، اور بعید نہیں کہ بے اولاد ہو۔ پھر بچہ بھی بہت پیاری صورت کا تھا، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ خود حضرت موسیٰ کو بتاتا ہے کہ وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ (میں نے اپنی طرف سے تیرے اوپر محبت ڈال دی تھی)، یعنی تجھے ایسی موہنی صورت دی تھی کہ دیکھنے والوں کو بے اختیار تجھ پر پیار آجاتا تھا۔ اس لیے اس عورت سے نہ رہا گیا اور اس نے کہا کہ اسے قتل نہ کرو بلکہ لے کر پال لو۔ یہ جب ہمارے ہاں پرورش پائے گا اور ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں گے تو اسے کیا خبر ہوگی کہ میں اسرائیلی ہوں۔ یہ اپنے آپ کو آلِ فرعون ہی کا ایک فرد سمجھے گا اور اس کی قابلیتیں بنی اسرائیل کے بجائے ہمارے کام آئیں گی۔

بائیبل اور تلمود کا بیان ہے کہ وہ عورت جس نے حضرت موسیٰؑ کو پالنے اور بیٹا بنانے کے لیے کہا تھا فرعون کی بیٹی تھی۔ لیکن قرآن صاف الفاظ میں اسے امرأۃ فرعون (فرعون کی بیوی) کہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ صدیوں بعد مرتب کی ہوئی زبانی روایات کے مقابلے میں براہِ راست اللہ تعالیٰ کا بیان ہی قابلِ اعتماد ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ اسرائیلی روایات سے مطابقت پیدا کرنے کی خاطر عربی محاورہ و استعمال کے خلاف امرأۃ فرعون کے معنی "فرعون کے خاندان کی عورت" کیے جائیں۔

۱۴؎ یعنی لڑکی نے اس طریقے سے ٹوکرے پر نگاہ رکھی کہ بہتے ہوئے ٹوکرے کے ساتھ ساتھ وہ اس کو دیکھتی ہوئی چلتی بھی رہی اور دشمن یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کا کوئی تعلق اس ٹوکرے والے بچے کے ساتھ ہے۔ اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت موسیٰ کی یہ بہن اس وقت ۱۰-۱۲ برس کی تھیں۔ ان کی ذہانت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ بھائی کا پیچھا کیا اور یہ پتہ چلا لیا کہ وہ فرعون کے محل میں پہنچ چکا ہے۔

ہم نے بچے پر پہلے ہی دودھ پلانے والیوں کی چھاتیاں حرام کر رکھی تھیں[۱۴]۔ (یہ حالت دیکھ کر) اُس لڑکی نے اُن سے کہا "میں تمہیں ایسے گھر کا پتہ بتاؤں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ اسے رکھیں؟"[۱۵] اس طرح ہم موسیٰ[۱۶] کو اس کی ماں کے پاس پلٹا لائے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا تھا[۱۷]، مگر اکثر لوگ اس بات

---

۱۴ یعنی فرعون کی بیوی جس انّا کو بھی دودھ پلانے کے لیے بلاتی تھی، بچہ اس کی چھاتی کو منہ نہ لگاتا تھا۔

۱۵ اس سے معلوم ہوا کہ فرعون کے محل میں بھائی کے پہنچ جانے کے بعد بہن گھر نہیں بیٹھ گئی، بلکہ وہ اپنی اسی ہوشیاری کے ساتھ محل کے آس پاس چکر لگاتی رہی۔ پھر جب اسے پتہ چلا کہ بچہ کسی کا دودھ نہیں پی رہا ہے اور ملکہ عالیہ پریشان ہیں کہ کوئی ایسی انّا ملے جو بچے کو پسند آئے تو وہ ذہین لڑکی سیدھی محل میں پہنچ گئی اور جا کر کہا کہ میں ایک اچھی انّا کا پتہ بتاتی ہوں جو اس بچے کو بڑی شفقت کے ساتھ پالے گی۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قدیم زمانے میں ان ممالک کے بڑے اور خاندانی لوگ بچوں کو اپنے ہاں پالنے کے بجائے عموماً انّاؤں کے سپرد کر دیتے تھے اور وہ اپنے ہاں ان کی پرورش کرتی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بھی یہ ذکر آتا ہے کہ مکہ میں وقتاً فوقتاً اطراف و نواح کی عورتیں انّاگیری کی خدمت کے لیے آتی تھیں اور سرداروں کے بچے دودھ پلانے کے لیے اچھے اچھے معاوضوں پر حاصل کر کے ساتھ لے جاتی تھیں۔ حضورؐ نے خود بھی حلیمہ سعدیہ کے ہاں صحرا میں پرورش پائی ہے۔ یہی طریقہ مصر میں بھی تھا۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ کی بہن نے یہ نہیں کہا کہ میں ایک اچھی انّا لا کر دیتی ہوں، بلکہ یہ کہا کہ میں ایسے گھر کا پتہ بتاتی ہوں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمہ لیں گے اور اسے خیر خواہی کے ساتھ پالیں گے۔

۱۶ بائیبل اور تلمود سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کا یہ نام فرعون کے گھر میں رکھا گیا تھا۔ یہ عبرانی زبان کا نہیں بلکہ قبطی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں "میں نے اسے پانی سے نکالا"۔ قدیم مصری زبان سے بھی حضرت موسیٰ کے نام کی یہ تخریج صحیح ثابت ہوتی ہے۔ اس زبان میں "مو" پانی کو کہتے تھے اور "اوشے" کا مطلب تھا "بچایا ہوا"۔

۱۷ اور اللہ کی اس حکیمانہ تدبیر کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ حضرت موسیٰ فی الواقع فرعون کے شاہزادے

ع ۱

کو نہیں جانتے ؏

نہ بن سکے بلکہ اپنے ہی ماں باپ اور بہن بھائیوں میں پرورش پاکر انہیں اپنی اصلیت اچھی طرح معلوم ہو گئی۔ اپنی خاندانی روایات سے، اپنے آبائی مذہب سے، اور اپنی قوم سے ان کا رشتہ نہ کٹ سکا۔ وہ آلِ فرعون کے ایک فرد بننے کے بجائے اپنے دلی جذبات اور خیالات کے اعتبار سے پوری طرح بنی اسرائیل کے ایک فرد بن کر اٹھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں مثل الذی یعمل ویحتسب فی صنعتہ الخیر کمثل ام موسیٰ ترضع ولدھا وتاخذ اجرھا۔ "جو شخص اپنی روزی کمانے کے لیے کام کرے اور اس کام میں اللہ کی خوشنودی پیشِ نظر رکھے اس کی مثال حضرت موسیٰ کی والدہ کی سی ہے کہ انہوں نے اپنے ہی بیٹے کو دودھ پلایا اور اس کی اجرت بھی پائی"۔ یعنی ایسا شخص اگرچہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کام کرتا ہے لیکن چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پیشِ نظر رکھ کر ایمانداری سے کام کرتا ہے، جس کے ساتھ بھی معاملہ کرتا ہے اس کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے، اور رزقِ حلال سے اپنے نفس اور اپنے بال بچوں کی پرورش اللہ کی عبادت سمجھتے ہوئے کرتا ہے، اس لیے وہ اپنی روزی کمانے پر بھی اللہ کے ہاں اجر کا مستحق ہوتا ہے۔ گویا روزی بھی کمائی اور اللہ سے اجر و ثواب بھی پایا۔

محسنِ انسانیتؐ

معاہدات

(از جناب نعیم صدیقی صاحب)

(بسلسلۂ گذشتہ)

معاہدات استوار کرنا اور حلیفانہ تعلقات قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا، خصوصاً جبکہ مذہبی اختلافات موجود ہوں، سیاسی تعصبات پیدا ہو جائیں، درمیان میں کھلی کھلی مخالف طاقتیں مداخلت کر رہی ہوں۔ اور معاملہ بالعموم ایسے قبائل اور عناصر سے ہو جو سابق تعلقات نہ رکھنے کی وجہ سے بالکل اجنبی ہوں۔ اس کام کے لیے بڑی سیاسی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مخاطب کے حالات اور رجحانات کو دیکھنا، وقت کو پہچاننا، اس توازنِ قوت کو سمجھنا جو کسی خاص لمحے مختلف اجزائے معاشرہ کے درمیان کارفرما ہو، مخالف طاقتوں کے اثرات کا مطالعہ کرنا، شرائط کی وہ خاص درمیانی لکیر تلاش کر لینا جہاں تک کسی قبیلے یا عنصر کو لایا جا سکتا ہو اور پھر نفسیاتی لحاظ سے گفت و شنید میں اثرانداز ہو جانا ــــ ایسے بے شمار لوازم پورے کرنے پڑتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دائرہ کار میں جس درجے کی سیاسی بصیرت اور قائدانہ مہارت اور "ڈپلومیٹک" کا نمونہ پیش کیا ہے اس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی، اور اس وجہ سے نہیں مل سکتی کہ حضورؐ نے اتنے وسیع تعلقات مختلف حالات میں پیدا کرتے ہوئے کسی بھی موقع پر نظریۂ حق، اپنے اخلاقی اصولوں اور اپنے سیاسی مرتبے کو ذرا سا بھی نقصان پہنچنے نہیں دیا۔ ورنہ ڈپلومیٹک دائرے میں جس بُری طرح سے اصولِ اخلاق کا قتلِ عام ہوتا ہے، اسی کی وجہ سے لفظ "ڈپلومیسی" بدنام ہو کر رہ گیا۔ خود سیاست آج ایک مکروہ مشغلہ اسی لیے بن کر رہ گئی ہے کہ سیاست کا کوئی اخلاق نہیں ہوتا اور یہ ایک ایسا ٹینک ہے کہ جدھر کو حرکت کرتا ہے انسانیت کی قیمتی قدروں کو روندتا چلا جاتا ہے۔ مگر حضورؐ نے ڈپلومیسی اور

سیاست کا بالکل مفہوم بدل کے رکھ دیا اور ان کاموں کو نہ صرف آلائشوں سے پاک کر دیا بلکہ نیکی اور عبادت کی روح سے سجا دیا۔ اسلامی اصولوں کے ساتھ سیاسی اور ڈپلومیٹک سرگرمیوں کو جاری رکھنا اور پھر ان میں غیر معمولی درجے کی کامیابی حاصل کرنا اور اس کے ذریعے بے شمار بکھرے ہوئے قبائل کو اپنے گرد مجتمع کر لینا آج کتابوں کے اوراق میں پڑھتے ہوئے آسان معلوم ہوتا ہے مگر ریگستانِ عرب میں جب عملاً یہ کام ہو رہا ہوگا تو کرنے والا ہی جان سکتا ہے کہ کیسی کٹھن مہم ہوگی۔

معاہدانہ روابط کا یہ سلسلہ نہ صرف اس لحاظ سے دعوت کی توسیع میں مد تھا کہ حلیف قبائل میں مسلم داعیوں کو آمد و رفت اور عوام سے گھلنے ملنے کے کھلے مواقع حاصل ہو جاتے تھے اور خود ان قبائل کے افراد کا رابطہ بھی مدینہ سے بڑھ جاتا تھا، بلکہ یہ اس لحاظ سے بھی تحریک کے اثرات کی توسیع کا موجب تھا کہ اس کی وجہ سے مسلم طاقت اپنی سیاسی بصیرت کی وجہ سے عوام کی معتمد علیہ بنتی چلی گئی۔ لوگ محدود مذہبی اور صوفیانہ تصورات کے بنائے ہوئے نیک آدمیوں پہ کتنے بھی فریفتہ ہوں اور ان کے تقدس سے مرعوب رہیں، لیکن وہ زندگی کی قیادت کی باگ ڈور انہیں کبھی نہیں سونپا کرتے۔ زندگی کی قیادت دنیا میں ہمیشہ ان عناصر کو دی جاتی ہے جن کے بارے میں اندازہ ہو کہ یہ کارپردازی کے لیے ضروری بصیرت رکھتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کسی گروہ کے بارے میں بڑی ستائش سے کام لے کر کہا کرتے ہیں کہ وہ تو بڑے اچھے لوگ ہیں، بڑے نیک کام کرتے ہیں، بڑی خدمتِ خلق میں مصروف ہیں لیکن اس ستائش میں یہ تاثر بھی مضمر ہوتا ہے کہ کارِ دنیا کے لیے یہ سخت ناموزوں بھی ہیں۔ ایسے گروہ لوگوں کی یہ باتیں سن کر بارہا مغالطوں میں بھی پڑ جاتے ہیں کہ رائے عام ہمارے حق میں اچھی ہے۔ مسلم طاقت اگر ایسا انسانی کردار بنا کے سامنے لائی ہوتی جو مذہبی رنگ میں نیکی کا پیکر اور روحانی لحاظ سے تقویٰ کا مجسمہ تو ہوتا لیکن معاملاتِ دنیا اور مسائلِ تمدن و سیاست میں کوئی اہلیت نہ دکھا سکتا تو تاثر یہ تو ہوتا کہ کچھ بھلے لوگ ہیں، اللہ والے ہیں، اچھی باتیں کہتے ہیں اور لوگوں سے نیک سلوک کرتے ہیں لیکن ایسا قطعاً ممکن نہ تھا کہ عوام الناس ان سے کسی نظامِ نو کی اقامت کی امیدیں رکھتے اور ان کو سلطنت چلانے اور سماج کی قیادت

کرنے کا اہل مان سکتے۔ اسلامی تحریک ایسے "اللہ لوک" بنانے نہیں آئی تھی جو بہ حیثیت فرد بہت ہی اللہ والے، بھلے مانس اور مسکین تسلیم کیے جائیں لیکن اجتماعی دائرے میں کارفرما اور کارپرداز بننے کے لیے سیاسی بصیرت کا ضروری سرمایہ نہ رکھتے ہوں۔ لوگ ان کو ایک متبادل مگر صالح ترقیادت کی حیثیت سے قبول نہ کریں اور ان کے ہاتھوں کسی روشن مستقبل کی تعمیر کی توقع نہ رکھیں۔ مسلم کردار جتنا زیادہ خدا پرست اور متقی تھا اتنا ہی زیادہ سیاسی بصیرت سے بھی آراستہ تھا۔ اس معاملے میں اس نے اپنا سکہ اپنی عملی کارگزاری سے منوا لیا۔ جوں جوں لوگ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جلو میں اقدام کرنے والی مسلم طاقت کی قائدانہ صلاحیتوں سے متاثر ہوتے گئے، مدینہ ان کی امیدوں کا مرکز بنتا گیا اور اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے دل بھی اسی تدریج سے اسلام کے لیے کھلتے چلے گئے۔ گویا دین کی دعوت اور سیاسی اثرات کی توسیع کے دونوں کام ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے اور ایک دوسرے کے لیے ممد!

یہ حقیقت ذہن میں رکھ کر ان معاہدانہ تعلقات کا جائزہ لیجیے جو حضورؐ نے بڑے وسیع پیمانے پر قائم کر دکھائے اور اس کام میں آپ کی رفتارِ کار حیرت انگیز حد تک تیز رہی ۔۔۔ باوجودیکہ ذرائع رسل و رسائل کے لحاظ سے حالات سخت ناموافق تھے۔

۱۔ بیعتِ عقبہ | معاہدانہ روابط میں سرِفہرست بیعتِ عقبہ آتی ہے جو بیک دم ایک پہلو سے مذہبی میثاق ہے اور دوسرے پہلو سے سیاسی معاہدہ۔ پہلی بار کی بیعت میں محسنِ انسانیت کے ہاتھ پر انصاری نوجوانوں نے قبولِ رسالت کی بیعت کی اور دوسری بار آپؐ کی سیاسی قیادت کا عہد بھی شامل کیا۔ مکہ سے منیٰ کو جاتے ہوئے راستے کے دونوں طرف پہاڑوں کی متوازی دیواریں آتی ہیں۔ منیٰ سے کوئی ایک فرلانگ بھر پہلے بائیں ہاتھ کی پہاڑی میں نصف دائرے کا ایک کھاؤ ہے اور اس کھاؤ کے دامن کے طور پر ایک میدانی قطعہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی وہ محفوظ جگہ ہے جہاں راتوں کے پُراسرار سکوت میں بیعت ہائے عقبہ واقع ہوئیں۔ مدینہ میں یہود کی موجودگی کی وجہ سے انصار الہامی دین کا ذوق رکھتے تھے اور سلسلۂ نبوت سے انہیں تعارف حاصل تھا۔ نیز آخری نبیٔ موعود کی پیشینگوئیاں ان کے

سامنے تھیں اور یہود کا یہ چیلنج بھی کہ جب وہ نبی آجائے گا تو ہم اس کے ساتھ ہو کر تم لوگوں کو مغلوب کریں گے۔ اس طرح انصار میں جہاں الہامی ہدایت کی طلب پیدا ہو چکی تھی وہاں غیر شعوری طور پر یہ جذبہ بھی اثر انداز تھا کہ وہ نبی آجائے تو ہم پہلے لبیک کہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اوس و خزرج کے درمیان باہمی آویزش کا جو سلسلہ چلا آرہا تھا اس سے تھک کر وہ ایک دورِ امن کے خواہاں تھے مگر رکاوٹ یہ تھی کہ دونوں میں سے کوئی قبیلہ بھی سابق حریفانہ فضا کی وجہ سے دوسرے قبیلہ کی قیادت قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ ان کو کسی تیسری طاقت کی احتیاج تھی۔ یہ سارے وجوہ تھے جن کے زیرِ اثر مدینہ کے ذہین اور شریف لوگوں کو جونہی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست تعارف ہوا اور حضورؐ کی دعوت سننے کا موقع ملا تو قبولیت کے لیے ان کے دل کھل گئے۔ نبوت کے چرچے تو ان تک پہلے ہی پہنچ چکے تھے، لیکن بالمشافہ گفتگو نے انہیں قطعی فیصلہ تک پہنچا دیا۔ آنحضورؐ کی وجاہت اور شخصیت کا اثر جب کلماتِ دعوت میں شامل ہوا ہوگا تو اس ذہنی انقلاب کی تکمیل ہو گئی ہوگی، جس کے لیے انصار کی فطرت میں پہلے سے آمادگی موجود تھی۔ وہ لمحہ ایک عجیب نازک تاریخی لمحہ تھا یعنی انصارِ مدینہ (پہلی بیعت کے موقع پر) یہ ارادہ لے کے چلے تھے کہ قریش سے حریفانہ رابطہ استوار کریں اور اگر ایسا ہو جاتا تو تحریکِ اسلامی کی تاریخ کا رُخ کچھ دوسرا ہوتا۔ مگر عین وقت پر جماعتِ انصار کا ارادہ بدلتا ہے اور وہ قریش کا خیال چھوڑ کر اس نئی قوت سے رابطہ جوڑ لیتے ہیں جو تاریخ کے افق سے اپنی ابتدائی کرنوں کے ساتھ آغازِ طلوع کر رہی تھی۔

پہلی مرتبہ کی بیعت میں حضورؐ نے چند اعتقادی و اخلاقی امور کا عہد لیا۔ یعنی معاہدہ باندھنے والے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ گردانیں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے، اولادوں کو قتل نہیں کریں گے، کسی کے خلاف کوئی بہتان نہیں گھڑیں گے اور معروف کے دائرے میں رسولِ خدا کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

دوسری بیعت میں انصار نے ان امور کا اضافہ کیا کہ ہم رسول اللہ کے سامنے ہر حال میں سمع و طاعت سے کام لیں گے، چاہے مشکلات درپیش ہوں یا آسانیاں ہوں، ہمارے دلوں کو

کوئی حکم پسند ہو یا ناپسند اور خواہ کوئی بات ہماری رایوں کے خلاف ہو رہی ہو، اور یہ کہ ہم اہلِ قیادت سے کشمکش نہیں کریں گے، اور یہ کہ ہم کسی بھی حال اور کسی بھی موقع میں ہوں حق بات کہیں گے، اور یہ کہ اللہ کے دین کے معاملے میں ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔"

ان مختصر الفاظ میں گویا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور انصار کے درمیان سیاسی رابطہ استوار ہوگیا اور اس جماعت نے واضح طور پر ایک سیاسی جماعت کی حیثیت اختیار کرلی۔ حضورؐ کی قیادت کو انہوں نے سمع وطاعت کے عہد کے ساتھ پوری طرح قبول کیا، یہ اقرار بھی باندھا کہ اربابِ قیادت کے خلاف کوئی کشمکش نہ کی جائیگی اور جاہ ومنصب کو چھیننے جھپٹنے کے لیے کوئی اقدام نہ ہوگا۔ مشاورت کا اصول طے پاگیا کہ ہر موقع پر حق بات پیش کی جائے گی اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے بارے میں پیمان بندھ گیا کہ جو جو کچھ فرائض اور مطالبات اور ذمہ داریاں ہم پر عائد ہونگی انہیں دنیا بھر کے طعن وملامت سے بے نیاز ہو کر سرانجام دیں گے۔ یہ ایسی بیعت تھی کہ اس کے بعد جونہی کوئی قطعۂ ارضی (TERRITORY) اس جماعت کے زیر اثر آجائے جس میں اس کے اوپر کوئی سیاسی اقتدار کارفرما ہو بلکہ قیادت اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو تو یہ جماعت معاً ایک ریاست میں بدل جائے۔

ان امور کے ساتھ مزید یہ بھی طے پاگیا کہ حضورؐ کے مدینہ منتقل ہوجانے پر معاہدہ باندھنے والے انصار حضورؐ کی ایسی ہی حفاظت کریں گے جیسی کہ وہ اپنے ازواج واولاد کی کرتے ہیں۔ گویا مدینہ کی اسلامی جماعت اور حضورؐ کے درمیان دفاعی وحدت کا تعلق بھی قائم ہوگیا اور اس لحاظ سے بیعت عقبہ کی سیاسی قدر وقیمت اور زیادہ بڑھ کر "انقلابی" ہوجاتی ہے۔

پھر حضورؐ کے ارشاد سے انصارِ مدینہ کی اسلامی جماعت کی طرف سے بارہ نمائندہ نقیب نامزد کیے جاتے ہیں جو حضورؐ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ان نقیبوں کے سر دعوتِ اسلامی کو پھیلانے کے علاوہ سیاسی ذمہ داری بھی ڈالی گئی۔ بقول عبداللہ بن ابی بکرؓ حضورؐ نے ان نقیبوں سے فرمایا کہ تم لوگ اپنی اپنی قوم کے اسی طرح ذمہ دار ہو جیسے حضرت عیسیٰ کے سامنے ان کے حواری ذمہ دار تھے اور

میں بھی اپنے گروہ — یعنی مسلم جماعت — کا ذمہ دار ہوں[1]۔

نقیبوں کے تقرر کے ساتھ مدینہ کے لیے جو تنظیمی ہیئت تشکیل دی گئی وہ فقط مذہبی نہ تھی بلکہ سیاسی و انقلابی تھی۔ ایسی ہیئت کی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ وہ جلد از جلد — پہلا موقع ملتے ہی — ریاست کی شکل اختیار کرے۔ عالمِ واقعہ میں ہوا بھی یہی کہ حضورؐ کے جانے کے چند ماہ بعد اسلامی ریاست کی نیو ڈال دی گئی۔

گویا اسلامی تحریک ابتدائی دعوت کا دور پورا کر کے سیاسی تعمیر کے دور میں داخل ہوئی تو معاہدہ کے ذریعے داخل ہوئی، نہ کہ جنگی قوت کا استعمال کر کے۔

۲۔ دستوری معاہدہ | نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں چلنے والی تحریکِ اسلامی کی تاریخ میں دوسرا عظیم ترین معاہدہ وہ ہے جس پر مدینہ کی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ شاید دنیا بھر کی تاریخ میں مجرد ایک ریاست کا قیام بھی بغیر تھوڑی بہت قوت استعمال کیے نہیں ہوا ہوگا، کجا کہ معاملہ ایک نظریاتی ریاست کا ہو جس کے اساسی نظریہ نے ماحول میں ہل چل مچا دی ہو۔ پھر اس کا قیام ایک اجنبی ماحول میں اور گوناگوں عناصر کے تعاون سے عمل میں آئے۔ یہ دستوری معاہدہ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی بصیرت اور قائدانہ مہارت کی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہے جس کا کہیں جواب نہیں۔ اس معاہدہ کے فریقوں کو دیکھیے تو ان میں مہاجرین شامل ہیں، انصار کے دو بڑے قبائل اوس و خزرج کے مسلم افراد شامل ہیں، ان کے مشرک اور یہودی افراد شامل ہیں، یہود کے متعدد قبائل شامل ہیں جن کا کہ ان میں باہمی چپقلش موجود تھی۔

درحقیقت حضورِ پاک ننہالی تعلقات کی وجہ سے مدینہ کو بچپن سے جانتے تھے کیونکہ وہاں رہ چکے تھے۔ پھر بہ حیثیت داعیِ حق آپؐ نے مکہ ہی کے آخری دو تین برس میں مدینہ سے رابطہ قائم ہو جانے کے بعد وہاں کے مخصوص حالات پر سیاسی نقطۂ نظر سے اچھی طرح کاوش کی تھی اور ہجرت کے بعد مدینہ آکر تو براہِ راست وہاں کے جملہ عناصر کے باہمی معاملات کا فہم حاصل کر لیا تھا۔ مدینہ کی کل آبادی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۶ تا ۸۵، عہدِ نبوی کے میدان ہائے جنگ۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۱ تا ۱۰

اس وقت اندازاً ۵ ہزار ہوگی اور اس تعداد میں تقریباً نصف یہودی تھے۔ اس ساری آبادی میں مہاجرین اور انصار کو ملا کر مسلم گروہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۵ سو ہوگی۔ اسی فعال، بیدار اور منظم اقلیت کے بل پر حضورؐ نے ۵ ہزار کی آبادی کو اپنی قیادت کے حلقہ میں لے لیا۔ انصار کے دونوں قبیلے جو ۱۲ ضمنی قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک تاریخ آویزش رکھتے تھے اور عام آبادی بھی تصادم در تصادم کے چکر سے تھکی ہوئی تھی، کیونکہ ہمیشہ کچھ عرب اور کچھ یہودی ایک طرف اور کچھ عرب اور کچھ یہودی دوسری طرف ہو کر جنگ و جدل میں پڑتے رہتے تھے۔ اب امن کی پیاس موجود تھی اور اسی مقصد سے ایک تعمیری قیادت کی طلب کارفرما تھی۔ کچھ ہی مدت پہلے قیادت کا خلا پُر کرنے کے لیے عبداللہ بن ابی کی تاجپوشی کی تیاریاں شروع بھی ہو چکی تھیں، لیکن یکایک حضورؐ اور آپؐ کی دعوت سے تعارف حاصل ہو جانے پر انصار ادھر متوجہ ہو گئے۔ خود یہودیوں کا حال بھی یہ تھا کہ ان کے دو بڑے گروہ جو اصل طور پر ۳ قبیلوں میں منقسم تھے باہم دگر حریف تھے اور ایک غیر نسل اور غیر علاقے میں انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں مٹ مٹا نہ جائیں۔ پھر جب یکایک حضورؐ نے انصار کو اپنے ساتھ وابستہ کر لیا اور ان کے سابق حلیفانہ روابط یہودیوں سے ٹوٹنے لگے، تو اس وقت یہودیوں نے پیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس کی۔ اس صورتِ حالات میں نبی اکرمؐ نے یہود کے حق میں وحیِ الٰہی کے تحت تالیفِ قلب کرنے اور ان کے بہترین جذبات کو اپیل کرنے کی سعیِ بلیغ کی تو سیاسی وحدت قائم کرنے کے لیے میدان ہموار ہو گیا۔ مدینہ کی آبادی کے جملہ عناصر کو سمجھنا، ان کے مفاد اور مسائل کا شعور حاصل کرنا اور ان کی نفسیات کو مناسب رُخ پر ڈھالنا اور پھر اس عظیم سیاسی کارنامہ کو بہت ہی کم مدت میں سرانجام دے لینا محسنِ انسانیت کی سیاسی عظمت سے ہمیں مرعوب کر دیتا ہے۔

مسلم جماعت جو اعتقاداً اور اخلاقاً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کے تحت انتہائی مضبوط تنظیم رکھتی تھی اور پھر بیعتِ عقبہ نے اسے ایک سیاسی انقلابی پارٹی کی حیثیت بھی دے دی تھی، نیز یہ اپنی اصولی دعوت کے زور سے نشوونما پانے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی، اس نے مدینہ میں سیاسی لحاظ سے مرکزی اہمیت حاصل کر لی۔ انصار کے قبائل میں نہ کوئی جوابی نظریہ یا ردِّ عمل موجود تھا اور نہ کوئی

مقابل کی مثبت یا منفی ذہن کی قیادت ۔ کیونکہ ان کے سرداروں کی بیشتر تعداد پہلے ہی اسلامی تحریک کی طرف کھنچ آئی تھی۔ ان کے اندر کے مشرک اور یہودی افراد اچھی خاصی بڑی تعداد رکھنے کے بعد کوئی مخالفانہ حرکت نہیں رکھتے تھے بلکہ پُرسکون تھے اور سیاسی حیثیت سے سرکردہ مسلم عناصر کے پیچھے چلنے والے تھے۔ یوں بھی کوئی اکا دکا عرب یا یہودی قبیلہ مسلم جماعت کے مقابلے میں کچھ بھی وزن نہیں رکھتا تھا۔ مدینہ کی آبادی کے عناصر کی یہ ترتیب حضورؐ کے نقشۂ کار کے لیے بالکل سازگار تھی اور آپ نے ابتدائی مسائل سے فارغ ہوتے ہی چند ماہ کے اندر اندر ہیئتِ سیاسیہ کی تشکیل کر لی۔

مذکورہ بالا معاہدہ جو یورپین مستشرقین کے تجزیہ کے مطابق ۵۲ دفعات پر مشتمل ہے: تاریخی ریکارڈ کی بنا پر اس معاہدے کے متعلق ایک اختلاف یہ ہوا ہے کہ بعض لوگوں نے پوری دستاویز کا ۱ھ میں لکھا جانا بیان کیا ہے اور بعض نے تحقیقی رائے یہ بھی دی ہے کہ اس کا ایک حصہ ۱ھ کا ہے اور دوسرا حصہ اس میں غزوۂ بدر کے بعد شامل کیا گیا ہے۔ یعنی مغربی تقسیم کے مطابق دفعات ۱ تا ۲۳ اور ۲۴ تا ۴۷ دو الگ الگ حصے ہیں۔ ہم اگر اس دوسری رائے کو قبول کر لیں تو اس صورت میں بھی رسولِ خدا کی سیاسی حکمت کارفرما نظر آتی ہے۔ حضورؐ نے پہلے مہاجرین اور جملہ انصار (مسلم و غیر مسلم) پر مشتمل ہیئتِ سیاسیہ کی تشکیل کر دی۔ اس کے وجود میں آجانے کے بعد یہودی قبائل نے اپنے آپ کو الگ رکھتے ہوئے کمزور اور معرضِ خطر میں محسوس کیا ہوگا، کیونکہ سیاسی لحاظ سے وہ بالکل ہوا میں معلق رہ گئے تھے۔ پھر جب انہوں نے مسلم طاقت کو میدانِ بدر سے اپنی توقعات کے خلاف فاتح بن کر نکلتے دیکھا ہوگا تو انہیں فکر ہوئی ہوگی کہ ہم کو بروقت مدینہ کی ہیئتِ سیاسیہ میں اپنی جگہ بنا لینی چاہیے۔

یہ دستوری دستاویز جس کی نظیر بقول ڈاکٹر حمید اللہ پہلے کی تاریخ میں قطعاً نہیں مل سکی اعلیٰ درجہ کے سیاسی سلیقے سے لکھی گئی ہے، نہایت ہی محتاط دستاویزی زبان میں ہے۔ اور اس میں حضورؐ نے اپنی مطلوبہ نظریاتی و سیاسی اقتدار کو مختلف عناصر سے تسلیم کرایا ہے۔ یہ مناسب موقع ہے کہ ہم اس دستاویز کے اہم ترین مندرجات پر نگہ ڈالیں تاکہ اس کی سیاسی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔

اس دستاویز کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوا، اور اس کا سرعنوان ہے: "ھٰذا کتاب

من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم" ۔ یعنی یہ نوشتہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو نبی ہیں ۔ گویا پیرایۂ آغاز ہی میں نظریۂ اساسی کی بنیاد رکھ دی گئی ۔

اس دستاویز پر مبنی ہیئتِ اجتماعیہ کا مرکزی عنصر بہر حال مسلم جماعت کو قرار دیا گیا ہے ۔ مثلاً پیرایۂ آغاز میں دستوری نوشتہ کا دائرہ یوں نامزد کیا گیا ہے " بین المومنین والمسلمین من قریش ویثرب" اور اس پر اضافہ ہے " ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم " (دفعہ ۱) ۔ گویا ریاست کا مرکزی عنصر مکہ اور مدینہ کے اہلِ ایمان ہیں اور بقیہ ان کے تابع لاحق اور حامی ہونے کی صورت میں شہریت سے بہرہ مند ہیں ۔ چنانچہ یہود کے قبائل کو شریک معاہدہ کر کے " مومنین کے ساتھ " کے الفاظ سے سیاسی امتِ واحدہ میں شمار کیا گیا (دفعات ۲۵ تا ۳۵) ۔ پھر مندرج ہے کہ " اہلِ ایمان دوسرے انسانوں کے بالمقابل آپس میں ایک دوسرے سے بھائی چارہ رکھتے ہیں " (دفعہ ۱۵) ۔ پھر صلح و جنگ میں تمام مسلمانوں کو مشترک قرار دیا گیا ہے (دفعہ ۱۷) پھر ایمان والوں پر لازم ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ قصاص کے لیے مل کر اٹھیں اور قاتلوں کو پناہ نہ دیں، نیز ان پر زیادتی کر کے خون بہایا جائے تو اس کا انتقام لیں ۔ (دفعہ ۱۹، ۲۱، ۲۲) پھر لازم کیا گیا کہ کوئی ایمان والا کسی کافر کے بدلے میں کسی ایمان والے کی جان نہ لے گا اور نہ کسی ایمان والے کے خلاف کسی کافر کی مدد کرے گا (دفعہ ۱۴) ۔ مسلمانوں کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے سکتا ہے اور اسے اللہ کے ذمہ کی حیثیت سے سب کو نبھانا ہوگا (دفعہ ۱۵) ۔ جب کوئی اختلاف واقع ہو تو خدا اور محمدؐ کی طرف رجوع کیا جائے گا (دفعہ ۲۳) ۔ متقی ایمان والوں پر واجب کیا گیا کہ وہ ہر جرم، گناہ اور تعدی کی صورت میں اس کے انسداد میں متحد ہوں (دفعہ ۱۳) ۔ ابتدائی حصے میں دستور کی نظریاتی روح کو نمایاں کرنے کے لیے بار بار یہ جملہ آتا ہے کہ فلاں فلاں (مسلم) قبیلہ فدیہ وغیرہ کے معاملات میں " معروف " اور " قسط " پر کاربند ہوگا ۔ اور وہ بھی اس مفہوم کے ساتھ جو " بین المومنین " مسلّم ہے (دفعہ ۳ تا ۱۲) ۔ نہایت ہی اہم اسلامی اصطلاح " فی سبیل اللہ " بھی شاملِ دستور کی گئی (دفعہ ۱۹) اسی طرح " ظلم " اور " بر " اور " اثم " کی اصطلاحات بھی متن میں داخل ہوئیں ۔ (دفعہ ۳۶) ۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ نکتہ شاملِ دستاویز ہے کہ " متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے

سیدھے راستے پر ہیں (دفعہ ۲۰)۔ پھر "ان النصر للمظلوم" کے الفاظ سے ایک خالص اسلامی کلیہ جو بین الانسانی بھی ہے، تسلیم کرا لیا گیا۔ اور یہ بھی کہ خدا اُس کے ساتھ ہے جو اس صحیفہ کے مندرجات کی تعمیل زیادہ سے زیادہ اخلاص و وفاداری سے کرے۔" (دفعات ۴۲-۴۶-۴۷)

اس دستاویز میں سیاسی امور کو جس خوبی سے طے کیا گیا ہے اس کا بھی جائزہ لیجیے۔ دستاویز میں شرکاء کے سکنی علاقے یعنی جوفِ مدینہ کو (جس کا رقبہ تقریباً یکصد مربع میل تھا۔ مدینہ کا جغرافی ماحول ہم بیان کر چکے ہیں اور وضاحت کے لیے نقشہ بھی دیا گیا ہے) نہ صرف یہ کہ اسلامی ریاست کی ابتدائی سرزمین (TERRITORY) قرار دیا گیا ہے بلکہ اسے حرمِ مقدس بھی قرار دیا گیا (دفعہ ۳۹)۔ اس معاہدے کے جملہ شرکاء کو ایک سیاسی وحدت (انھم امۃ واحدۃ من دون الناس) قرار دیا گیا (دفعہ ۱)۔ یہ دفعہ سیاسی حکمت کی مظہر ہے کہ پہلے سے طے کر دیا گیا کہ یہود میں جو بھی ہماری اتباع کرے اسے مدد اور مساوات (یہ حقوقِ شہریت) حاصل ہو گی۔ یہ گویا پیش بندی بھی تھی اور ترغیب بھی۔ (دفعہ ۱۶) کمالِ سیاست کا شاہکار یہ ہے کہ اختلاف ہونے پر اللہ اور اس کے رسول محمدؐ کی طرف رجوع کیا جائے گا (دفعہ ۲۳) کوئی جھگڑا یا قتل واقع ہو تو خدا اور خدا کے رسول محمدؐ کی طرف رجوع کیا جائے گا (دفعہ ۴۲)۔ کسی زخم یا مار کا بدلہ لینے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی (دفعہ ۳۶)، ظالم کے ظلم یا قاتل کے جرم کا وبال صرف اس کی ذات یا اس کے گھرانے (خون بہا میں خاندان شریک ہوتا تھا) پر ہو گا، کسی دوسرے پر نہیں (دفعہ ۲۵ و ۲۶) سیاسی ہیئت کے ابتدائی واحدے قبیلوں ہی کو قرار دیا گیا اور ان کو تسلیم کر کے ان پر مرکزی اقتدار قائم کیا گیا۔

دفاعی سیاست کے لحاظ سے یہ باتیں طے ہوئیں کہ: اگر یثرب پر حملہ ہو تو شرکاء کے لیے باہمی امداد کرنا ضروری ہو گا (دفعہ ۴۴)۔ اگر معاہدہ کے کسی فریق سے کوئی جنگ کرے تو اس کے خلاف سارے شرکاء سچے جذبے سے امداد کریں گے (دفعہ ۳۷)۔ اس دستاویز نے ایک دفعہ کے ذریعے دفاعی بالادستی بھی حضورؐ کے ہاتھ میں دے دی کہ کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر فوجی کارروائی کے لیے نہیں نکلے گا (دفعہ ۳۶)۔ کسی فریق کی اپنی مذہبی لڑائی کے بارے میں شرکاء کی کوئی ذمہ داری نہ ہو گی (دفعہ ۴۵)

اگر شرکاء کو کسی صلح کے لیے مدعو کیا جائے تو سب کے ساتھ وہ بھی صلح کریں گے (ایضاً) قریش کے حلیفانہ تعلقات کا قطعی خاتمہ کرنے کے لیے یہ بھی منوالیا گیا کہ کوئی مشرک (غیر مسلم شہری) قریش کے جان و مال کو کوئی پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی مومن کے آڑے آئے گا (دفعہ ۲۰) اور قریش کو کسی پناہ نہ دی جائے گی اور نہ اس کو جو انہیں مدد دے (دفعہ ۴۳) جنگی مصارف کے متعلق یہ حقیقت پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہودی اپنا حصہ ادا کرنے میں کنجوسی دکھائیں گے اور اگر اجتماعی فنڈ ان کے ہاتھ میں گیا تو وہ خیانت سے کام لیں گے ..... حضورؐ نے کمالِ بصیرت سے معاملہ یوں طے کیا کہ ہر فریق اپنے اپنے جنگی مصارف خود برداشت کرے گا۔ (دفعہ ۲۴-۳۷)

اقتصادی لحاظ سے ایک طرف خون بہا اور قیدیوں سے فدیہ کا بار عرب کے معروف طریقے پر شخصِ متعلق کے قبیلے پر پھیلا دیا گیا۔ غیر مستطیع مقروض کے قرض کی ذمہ داری بھی اجتماعی کر دی گئی۔

مذہبی آزادی کے لیے وضاحت کر دی گئی کہ مسلمانوں کے لیے ان کا دین اور یہود کے لیے ان کا مذہب (دفعہ ۲۵)۔ درحقیقت مسلم جماعت تو سیاست اور دین دونوں کے لحاظ سے ایک وحدت تھی اور اس پر دوہری ذمہ داریاں عائد تھیں مگر خالص سیاسی رابطے کے دائرے میں جملہ شرکاء کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی دی گئی۔[1]

اب ان نکات کو دستاویز کے خلاصہ کی حیثیت سے زیرِ نظر لائیے اور پھر ایک ایک جزو پر غور کیجیے کہ حضورؐ نے کس حکمت سے اپنی آئیڈیالوجی کو دستور کی اساس اور روح بنایا، مسلم جماعت کو مرکزی حیثیت دلائی، اپنی قیادت اور اتھارٹی ـــ سیاسی، دفاعی، عدالتی ـــ ہر لحاظ سے منوائی، قریش کا مقابلہ کرنے کے لیے سب کو مشترک نکات پر جمع کر لیا اور بے شمار خطرات کے رستے پہلے سے بند کر لیے۔ واضح رہے کہ اس "معاہدہ" کی نوعیت ایک دستوری دستاویز کی سی ہے جس کے کسی ایک فریق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ جب چاہے علیحدگی اختیار کر لے یا معاہدہ توڑ دے۔ ایسا کرنا سرے سے اس حقِ شہریت کو ختم کر دیتا ہے جسے اسلامی ریاست کے حدود میں بھی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۱۲۳-۱۱۹۔ عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۷۶ تا ۱۱۱

معاہدہ طے کر رہا تھا یہی وجہ ہے کہ جن یہودی قبائل نے بعد میں اس معاہدہ کو پوری طرح پامال کر دیا ان کے خلاف وہ کارروائی کی گئی جو غداروں اور باغیوں کے خلاف کی جاتی ہے۔

یہاں ضمناً فرضیتِ ہجرت کے اہم نکتہ کو اس دستاویز کی روشنی میں سمجھ لینے کا موقع ہے۔ مدینہ کی ریاست کی اساس جس مسلم جماعت پر رکھی گئی تھی، فرضیتِ ہجرت کا ایک مقصود یہ تھا کہ یہ جماعت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو۔ اس میں شک نہیں کہ عرب کے قبائلی نظام میں متفرق اکا دکا مسلمانوں کا پڑے رہنا اس امر کا موجب ہو سکتا تھا کہ وہ تھوڑی بہت کشمکش کر کے، بالآخر جاہلی معاشرے میں تحلیل ہو جائیں یا جبر و تشدّد کا شکار ہو جائیں۔ اس وجہ سے بھی ایک ایک ذرے کو سمیٹ لینا ضروری تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مدینہ کی اسلامی ریاست کا استحکام بھی پوری اہمیت سے اس کا متقاضی تھا۔ بعد میں جب یہ دونوں ضرورتیں باقی نہ رہیں تو "لا ھجرۃ بعد الفتح" کا اعلان کر دیا گیا یعنی جب سارا عرب دارالاسلام بن گیا اور مدینہ کی قیادت کے زیرِ نگیں آ گیا اور اسلام لانے والوں کے لیے کسی علاقے میں بھی مزاحم فضا باقی نہ رہی تو مدینہ ہجرت کر کے آنے کی پابندی اٹھا لی گئی۔

اس معاہدے کے مطابق مدینہ کی اسلامی ریاست وجود میں آئی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت قائم ہوئی، یکصد مربع میل علاقے میں جو ۵ ہزار کی آبادی رکھتا تھا، مسلمانوں کو دعوتِ حق کے لیے بالکل کھلا دائرہ پہلی بار حاصل ہوا جہاں اسلام کا سیاسی اقتدار بھی دعوت کے کام میں ازخود ممد تھا۔ پھر اس علاقے کے آس پاس جا کر کام کرنے کے لیے بھی اسلامی حکومت کا وجود کارکنوں کے لیے پشتیبان بن گیا۔

۲۔ **متفرق قبائل سے معاہدات** | مدینہ کو ایک سیاسی واحدہ بنانے اور اسلامی حکومت کی نیو ڈالنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ حضورؐ نے آس پاس کے قبائل کو ساتھ ملانے کی فکر کی۔ دو تین بار صحابہ کی جماعتوں کو مہمات پر بھیجا۔ ہجرت کے بارھویں مہینے یعنی صفر میں فرماں روائے مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس ودان (مدینہ سے بجانب مکہ ایک قصبہ ہے) کا رخ کیا۔ یہاں پہنچ کر آپؐ نے قبیلہ بنی حمزہ (یا بنی ضمرہ) بن بکر بن عبد مناف سے معاہدہ استوار کیا۔ قبیلہ کی جانب سے عمرو بن مخشی الضمری نے دستخط کیے[۱]۔ اس سے قبل مہاجرین کا ایک

[۱] ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۲۲۳، زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۳۴۲

وفد اسی جانب عیص کے مقام تک گیا اور حلیفانہ تعلقات کی اچھی فضا پیدا ہو گئی[۱] پھر ربیع الاول ۲ھ (ہجرت کے تیرھویں ماہ) میں دوبارہ بُواط (ینبوع کے علاقے میں جُہَینہ کے پہاڑوں میں سے ایک) کی جانب تشریف لے گئے۔ یہاں کی آبادی سے بھی گفت و شنید کامیاب رہی اور حلیفانہ تعلقات قائم ہو گئے[۲] پھر جمادی الاُخریٰ میں بمقام ذوالعُشَیرہ (علاقہ ینبوع) تشریف لے گئے۔ وہاں بنو مُدلِج اور ان کے حلیف قبیلہ بنو ضمرہ سے معاہدانہ روابط کے لیے گفت و شنید بہت دنوں جاری رہی۔ ان سے بھی معاہدہ ہو گیا[۳]۔ ہمارے پیش روؤں کی ایک رائے یہ ہے کہ ان معاہدات سے یہ قبیلے اور علاقے درحقیقت مدینہ کے سیاسی وحدہ کا جزو بن گئے تھے اور متعلقہ علاقہ مدینہ کی سلطنت کا ایک حصہ ہو گیا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ معاہدات کے بعض اہم اجزا اور بعض اصطلاحات دستوری معاہدہ سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن اگر بالکل ابتدائی دور کے متعلق ایسا نہ بھی تسلیم کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد میں جُہَینہ سے حلیفانہ تعلقات کا ارتقاء اس نہج پر جاری رہا کہ یہ لوگ دوسرے عرب قبائل سے بہت پہلے اسلام میں داخل ہوئے اور ایک ہزار کی جمعیت نے مدینہ آکر حضورؐ کی خدمت میں تعاون پیش کیا اور عملاً غزوات میں حصہ لیتے رہے۔ اس قبیلہ کی مختلف شاخوں سے اسلامی ریاست کے معاملات کا جو ریکارڈ موجود ہے وہ اسی کی توثیق کرتا ہے۔ مثلاً بنی الجُرمز (جہینہ کی ذیلی شاخ) کو حضورؐ نے امن و سلامتی کا تحریری پروانہ عطا کیا۔ بنی شمخ یا شخ (جُہینہ کی ذیلی شاخ) کو ان کا پورا علاقہ بطورِ جاگیر مستقل طور پر تفویض کر دیا۔ اسی طرح عوسجہ بن حرملہ جہنی کو اس کے مسکن ذوالمرہ (یہ جانبِ ساحل) کے قریب جاگیر کا پروانہ عطا کیا گیا۔ ابوبصیر اور ان کے ساتھیوں کے لیے جب معاہدۂ حدیبیہ کی وجہ سے مدینہ جانے کا موقعہ نہ رہا تو وہ مکہ سے ہجرت کر کے اسی ساحلی علاقے میں آگئے تھے۔ عین ممکن ہے کہ عوسجہ جیسے سرداروں کی حمایت بھی انہیں حاصل رہی ہو اور وہ مقامی لوگوں کے تعاون ہی سے قریشی قافلوں کی مزاحمت کرتے ہوں[۴]۔

---

[۱] رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص۲۵۹ [۲] رحمۃ للعالمین ج ا ص۱۲۹۔ زاد المعاد حوالہ ما سبق

[۳] ابن ہشام ص۲۳۵، رحمۃ للعالمین ج ا ص۱۲۹

[۴] رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی۔ مضمون "عام قبائلِ عرب سے تعلقات"۔

تعلقات اور آگے بڑھے۔ میل جول کی وجہ سے دعوت کا کام جاری رہا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قبائل بہ حیثیت مجموعی اسلامی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ عقبہ جہنی کی بیعتِ اسلام کا حال ہمارے سامنے ہے۔ حضورؐ کے دورِ آخر میں ایک نیا پروانہ امن بنی جُرمز، بنی الحرقہ اور عمرو بن معبد جہنی کے نام جاری ہوا جس میں وہ شرائط ہیں جو مسلم قبائل پر عائد ہوتی ہیں۔ یعنی نماز و زکوٰۃ کی پابندی، خمس کی ادائیگی، مخالفین اسلام سے انقطاع، قرضوں کے سود کا ترک ان کے لیے لازم کیا گیا تھا۔ مدینہ میں قبیلہ جُہَینَہ کے نام کی مسجد بھی دورِ نبوت میں بن گئی تھی، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خاصی تعداد میں جہنی لوگ اسلامی جماعت میں شامل ہو کر مدینہ آ گئے ہوں گے۔

بنو غفار ان چند قبائل میں سے ہیں جنہوں نے بڑی تعداد میں بہت پہلے اسلام قبول کیا۔ یہ قبیلہ اپنے مثالی نوجوان حضرت ابوذرؓ کی دعوت سے متاثر ہوا۔ جنگِ بدر کے قریبی زمانے میں اس قبیلہ کے لوگوں نے حضورؐ سے معاہدہ کیا جس کی اساس اس جملے پر ہے کہ "انھم من المسلمین وعلیھم ما علی المسلمین" ہماری رائے میں اگرچہ اس کے ایک جزء میں اس قبیلہ کے غیر مسلم عناصر کا لحاظ رکھا گیا ہے، لیکن فی الحقیقت یہ قبیلہ گویا مدینہ کی ہیئتِ اجتماعیہ کا جزو بن گیا اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کے علاقہ کو مدینہ کے زیرِ نگیں نہ سمجھا جائے۔

بنو ضمرہ جس کی بہت سی شاخوں میں سے ایک بنو غفار کی شاخ تھی، اسی کا ایک ذیلی قبیلہ بنو عبد بن عدی بھی تھا جس کا قیام حدودِ حرم میں تھا۔ اس شاخ نے قریش سے مجبورانہ تعلقِ مصالحت کے باوجود مسلم حکومت سے دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ صرف قریش کے خلاف جنگ میں شامل ہونے سے استثنیٰ حاصل کر کے بقیہ ہر لحاظ سے حضورؐ کے ساتھ حلیفانہ رابطہ جوڑ لیا۔

قبیلہ مُزَینہ مدینہ سے صرف ۲۰ میل کی دوری پر فرع کی سمت میں بجانب شمال مغرب القبول ابو یوسف آباد تھا۔ ۵ھ میں یہ قبیلہ حلقۂ اسلام میں شامل ہوا۔ لیکن ان سے حلیفانہ تعلقات لازماً ان کے ہمسایہ قبائل کے ساتھ ہی ساتھ آغاز پا چکے تھے۔ اس قبیلہ کے ایک سردار بلال بن حارث کو قَبَلِیَہ دیا قبیل، کی سونے کی کانیں حضورؐ نے بطورِ جاگیر عطا کیں۔ چنانچہ ایک حالیہ کھدائی میں یہاں کے قبرستان سے جاگیر کے فرمان کا کتبہ ملا ہے۔ فتح مکہ کے بعد سردار مذکور کو بہت سی زرعی زمین بھی بطورِ جاگیر دی گئی۔ ان باتوں سے یہ اخذ

ہوتا ہے کہ فرماں روائے مدینہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کتنی زیادہ توجہ ساحلی علاقے کے قبائل پر صرف کی، کیونکہ سیاسی جغرافیہ کے لحاظ سے بہ خاص کلیدی مقامات پر قابض تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جاگیروں کے فرامین یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ علاقے شروع ہی میں (ان قبائل کے قبولِ اسلام سے قبل) حکومتِ مدینہ کی سرزمین سے سیاسی طور پر ملحق ہو چکے تھے۔[1]

قبیلہ غطفان کی ایک شاخ بنو اشجع تھے۔ یہ بھی تجارتی شاہراہ کے متصل آباد تھے۔ شاہ راہ کی ناکہ بندی سے جب قریشی سلسلہ تجارت رُک گیا تو ان کی معاش پر اس کا اثر پڑا۔ کیونکہ یہ کاروانوں کی خدمت کر کے کمائی کر لیتے تھے۔ معاشی بحران سے مجبور ہو کر ان کا وفد مدینہ پہنچا اور معرکہ خندق سے قبل ہی انہوں نے اسلام قبول کر کے معاہدہ استوار کیا۔ ان کی طرف سے معاہدہ پر دستخط نعیم بن مسعود نے کیے۔ نعیم بن مسعود تو چند ساتھیوں سمیت عین غزوہ خندق کے دوران میں اسلامی تحریک کے دائرے میں آئے۔ اس بوقتِ معاہدہ سارا قبیلہ داخلِ اسلام نہ ہوا تھا۔ تاہم معاہدہ کی اساس اس فقرے سے واضح ہوتی ہے کہ "حالفه علی النصر والنصیحة" یعنی حمایت و نصرت اور خیر اندیشی و خیر سگالی کے وسیع تعلقات استوار ہوئے۔ اسی قبیلہ کی ایک شاخ بنو عامر بن عکرمہ نے قافلوں کے پڑاؤ کا کاروبار چلانے کے لیے استحقاقِ خصوصی کا پروانہ حضورؐ سے حاصل کیا۔ اس شاخ کے ایک سردار کو بھی غزوۂ خندق سے قبل جاگیر دی گئی۔[2]

اب ہم ان چند حلیفانہ رابطوں کا ذکر کرتے ہیں جو غزوۂ خندق کے مابعد قائم ہوئے۔

قبیلۂ خزاعہ یمن کی قحطانی نسل سے تعلق رکھتا تھا اور بہت سی شاخوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ مکہ کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے۔ بنی مصطلق کے علاوہ اس قبیلہ کی اکثر شاخیں مسلمانوں سے اچھے روابط رکھتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ جناب عبدالمطلب نے ان کے ساتھ مستقل حلیفی رکھی تھی۔ اس قبیلہ نے معاہدۂ حدیبیہ کی گنجائش سے فائدہ اٹھا کر علی الاعلان قریش کو چھوڑ کر مدینہ کی اسلامی حکومت سے حلیفی قائم کر لی۔ اسی رابطے کی بنا پر ایک طرف تو اس قبیلے نے جنگِ احزاب کے لیے قریش کی زیادتیوں

---

[1] رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ۔

[2] ایضاً

کی اطلاع حضورؐ کو پہنچائی اور دوسری طرف حضورؐ نے بھی فتح مکہ سے قبل ان کو ایک مکتوب میں اطمینان دلایا تھا کہ ان کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ نیز اطلاع دی تھی کہ بنو کلاب اور بنو ہوازن نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ لیکن وقت آنے سے قبل یہ بنو بکر کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے اور ان کی مظلومی ہی فتح مکہ کی محرک بنی۔

خزاعہ کی ایک شاخ بنو اسلم تھے۔ ان کے نام حضورؐ کا جو پروانہ ملتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ نسبتہً پہلے ہی سے اسلام میں داخل اور اسلامی ریاست کے زیرِ نگیں ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو مدینہ میں ہجرت کرکے آبسے تھے۔ اس خاندان کے سردار الحصین بن اوس کو حضورؐ نے جاگیر بھی عطا کی تھی جو حلیفانہ تعلقات کی محکمی کی دلیل بھی ہے اور اس سے متعلقہ علاقہ کا الحاق مدینہ سے ہونا بھی تمام ہو رہتا ہے۔

تبوک کے شمالی علاقے میں جذام، قضاعہ اور عذرہ کے قبائل آباد تھے جنہوں نے اپنے مخالفانہ رویہ سے خاصی مشکلات اسلامی حکومت کے لیے پیدا کی تھیں۔ ان لوگوں نے مدینہ کے سفیر کو لوٹ لیا تھا۔ پھر تادیبی مہم ان کے خلاف بھیجی گئی۔ اس مہم کی زد میں غلطی سے بعض بے قصور لوگ بھی آئے۔ پس یہ لوگ مدینہ میں فریاد لے کے آئے اور تلافی کی گئی۔ اس طرح تعلقات کی راہیں بھی کھلیں۔ حضورؐ کی دستاویزات میں ایک مکتوب رفاعہ بن زید جذامی کے نام ملتا ہے جس میں بڑا بھاری الٹی میٹم ہے۔ اس سردار کو مخاطب کرکے اس کی ساری قوم کو متنبہ کیا گیا ہے کہ یا تو وہ اسلامی دعوت کو قبول کرکے اللہ اور رسول کی جماعت میں شریک ہو جائے ورنہ روگردانی کرنے کی صورت میں دو ماہ کی امان ہے۔ حالات کا اس نہج سے ارتقاء بالآخر جس صورت پر منتج ہوتا ہے وہ یہ تھی کہ حضورؐ کی تبوک سے واپسی پر (۹ھ) مالک بن احمر جذامی نے مدینہ میں آکر حضورؐ سے ملاقات کی اور پروانہ حاصل کیا۔ اس پروانہ میں وہ شرائط درج ہیں جو معمولاً صرف مسلم قبائل کے لیے ہوتی تھیں۔ یعنی ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح قضاعہ کا ایک سردار بریدہ بن الخصیب کسی مہم کے دوران میں حضورؐ سے مدینہ کے باہر ہی ملا اور اس نے اپنی قوم کی طرف سے قبولِ اسلام کا قول دے کر پروانہ حاصل کیا۔

۶ھ میں قبیلہ کلب کی طرف حضورؐ نے عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو ایک دعوتی مہم پر بھیجا۔ نتیجہ حسب منشا نکلا اور سردار نے اظہارِ وفاداری اور استحکامِ رابطہ کے لیے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمٰن بن عوف سے

کر دیا۔ اسی طرح بارگاہِ نبوی سے ایک پروانہ کلبیوں کے نومسلم سردار حارثہ بن قطن کے نام جاری ہُوا، جو دومۃ الجندل کے قرب و جوار کے کلبیوں سے متعلق ہے۔ خود اکیدر (والیٔ دومۃ الجندل) سے معاہدہ ہُوا، اختلافِ روایات ہے کہ آیا وہ اسلام لایا یا بغیر اسلام لائے جزیہ دینے کی شرط پر سرداری بحال رکھا گیا۔ بہرحال بعد میں اس نے اپنے اسلام یا معاہدۂ طاعت سے انحراف کیا اور حضرت خالدؓ کے ہاتھوں قتل ہُوا۔ بعد میں اس کے قلعے اور افتادہ زمینوں کو اسی کلبی سردار حارثہ بن قطن کی تحویل میں دے دیا گیا۔

اہلِ طائف کے عمومی قبولِ اسلام سے قبل صرد بن عبداللہ یمنی اسلامی تحریک کے علمبرداروں میں آملے۔ حضورؐ نے ان کو اس علاقے میں فوجی کارروائیوں کے لیے کمانڈ تفویض کی۔ حضورؐ ہی کے اذن سے انہوں نے جرش کے قلعے کا محاصرہ کیا جو معاہدۂ صلح پر منتج ہُوا۔ مصالحت کے بعد یہاں کی گورنری ابوسفیانؓ کو سونپی گئی۔

بنو ازد جو عمان شہر میں آباد تھے اور عبید اور جیفر نامی دو اشخاص ان کے رئیس تھے، ان کی طرف عمرو بن العاص حضورؐ کا نامۂ دعوت لے کے ۸ھ میں گئے۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔[1]

ہم نے ان قبائل کا تذکرہ آئندہ اوراق کے لیے مؤخر کر دیا، جنہوں نے عام الوفود میں بطورِ خود مدینہ میں وفود بھیج کر اسلام قبول کیا یا کم سے کم حکومتِ مدینہ کی سیاسی اطاعت اختیار کی۔

علاوہ ازیں فوجی کارروائی کے نتیجے میں جہاں کسی گروہ نے اطاعت قبول کرنے یا مصالحت کرنے کی خواہش کی وہاں فوراً اس کے لیے راستہ دیا گیا۔ مدینہ کی مستقل اصولی پالیسی یہ تھی کہ محارب بھی صلح کا خواہاں ہو تو اس کی خواہشِ امن کا احترام کیا جائے۔ چنانچہ متعدد قبائل نے میدانِ جنگ میں اترنے کے بعد یا تو سیاسی اطاعت اختیار کر لی یا اسلام قبول کیا۔ اس سلسلے کی ایک نمایاں مثال خیبر اور ملحقہ علاقے کے یہودیوں کی ہے کہ مفتوح ہونے پر جب انہوں نے وہیں رہنے کی درخواست کی تو شرائط طے کر کے ان کو رکھ لیا گیا۔

ان سارے واقعات کو سامنے رکھیے تو ماننا پڑتا ہے کہ تصادم سے بچ کر حلیفانہ تعلقات پیدا کرنا حکومتِ مدینہ کی سرگرمیوں کا اہم ترین شعبہ تھا اور حضورؐ اور آپ کے رفقا نے بہت ساری مہمات

[1] سیرت النبی۔ شبلی نعمانی ص ۲۴۳۔

اسی شعبۂ کار کے لیے اٹھائیں اور متعدد سفر کیے۔ یہ سرگرمیاں اسلامی ریاست کے امن پسندانہ نقطۂ نظر کا بڑا بیّن ثبوت ہیں پھر اس معاملے میں حضورؐ نے ایک اصولی و نظریاتی ریاست کے تقاضے سامنے ہونے کے باوجود پالیسی میں یہاں تک وسعت رکھی کہ اسلام نہ لانے والے قبائل کی طرف سے محض سیاسی حلیفی کو بھی قبول کر لیا اور متعدد صورتوں میں غیر مسلم سرداروں اور حاکموں کو اپنی طرف سے مامور یا بحال فرمایا۔ مدعا یہی تھا کہ تصادم کے مواقع کم سے کم رہ جائیں۔ بعد کا یہ فیصلہ تو بہت سارے تلخ تجربات کی روشنی میں کیا گیا کہ کم سے کم جو سرزمین اسلامی تحریک کے گھر کی حیثیت رکھتی ہے اس کے ماحول کو پاک اور پُرامن رکھنے کے لیے اسے مخالف عناصر سے خالی کرا لیا جائے، ورنہ ان کی غدارانہ حرکات سارے کام کا ستیاناس کر دیں گی۔

اوپر کے روابط کا تجزیہ کر کے دیکھیں تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جہاں کہیں اسلام پہنچا وہاں سے مدینہ کو سیاسی اطاعت از خود حاصل ہوئی اور اسی طرح جہاں کہیں سیاسی حلیفی کا تعلق قائم ہو گیا وہاں بھی کچھ ہی مدت میں اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ قبائل کا جب مدینہ سے میل جول بڑھتا ہوگا تو وہ اسلامی نظریۂ حیات کے اعجازات کو مرئی آنکھوں سے دیکھ کر متاثر ہوتے ہوں گے، نیز ان کے اندر تحریک کے کارکنوں کو دعوتی کام کرنے کے لیے پُرامن فضا حاصل ہوتی ہو گی۔ دین و سیاست کی یہی وحدت تھی کہ جس نے بارہ لاکھ مربع میل علاقے کو چند برس میں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔

(باقی)

رسائل و مسائل

[مندرجہ ذیل سوالات ایک صاحب نے انگریزی زبان میں تحریر فرمائے ہیں۔ ہم یہاں ان سوالات کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ ترجمہ کرتے ہوئے ہم نے سائل کی ان پیچیدہ او ضمنی بحثوں کو حذف کر دیا ہے جو عام قارئین کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں]

مسئلہ ارتقاء

سوال ۔ ارتقاء کے متعلق لوگوں کے اندر مختلف نظریات پائے جاتے ہیں بعض مفکرین انسانی زندگی کا ظہور محض ایک اتفاقی حادثہ خیال کرتے ہیں بعض کے نزدیک (جن میں ڈارون سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے) انسان نے زندگی کی اعلیٰ اور ارفع حالتوں تک پہنچنے کے لیے پست حالتوں سے ایک تدریج کے ساتھ ترقی کی ہے اور یہ ترقی تنازع للبقاء اور بقائے اصلح کی رہین منت ہے۔ بعض لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ انسان ہمیشہ جغرافیائی ماحول کے سانچوں میں ڈھلتا رہا ہے جیسا کہ لامارک۔ بعض لوگ برگسان کے تخلیقی ارتقاء کے قائل نظر آتے ہیں۔ آپ کی تحریروں کے مطالعہ سے یہ بات منکشف نہیں ہو سکی کہ آپ ارتقاء کے کس پہلو کے مخالف ہیں۔ براہ کرم اس پہلو کی نشاندہی کریں۔

جواب : مسئلہ ارتقاء پر میں نے جو اعتراضات بھی کیے ہیں وہ دراصل ڈارونزم کے خلاف ہیں۔ نفسِ ارتقاء تو ایک امر واقعی ہے جس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن ڈارونزم ایک مفروضے سے زیادہ کچھ نہیں ہے، اور مفروضہ بھی ایسا جو تمام مشہود حقائق کی معقول توجیہ نہیں کرتا، بلکہ بعض حقائق کی قیاسی توجیہ کرتے ہوئے بہت سے حقائق سے نظر چرانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر ایک شدید علمی استبداد — جو پادریوں کے مذہبی استبداد سے اپنی متعصبانہ نوعیت میں کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے — اس کی پشت پناہی کرتا ہے

اور اس کے خلاف سائنٹفک تنقید کو برداشت نہیں کرتا۔ تاہم اس نظریے پر اب تک جو تنقیدیں گہرے علمی استدلال کے ساتھ ہوئی ہیں انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پر بکثرت اعتراضات ایسے ہیں جن کو رفع کرنے میں ڈارونزم کے حامی اب تک کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ آپ اس تنقیدی لٹریچر کا مطالعہ کر کے خود دیکھ لیں کہ اعتراضات کتنے وزنی ہیں اور جن چیزوں کو ڈارونزم کا ثبوت کہا جاتا ہے وہ کس قدر کمزور ہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک ہی کتاب THE REVOLT AGAINST REASON کے مطالعہ کا میں آپ کو مشورہ دوں گا۔ میں جس چیز کو صحیح سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ نباتات و حیوانات کی ہر نوع، اور اسی طرح نوع انسانی کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس طرح پیدا کیا ہے کہ ہر نوع کے پہلے فرد کو وہ براہ راست اپنے تخلیقی عمل سے وجود میں لایا اور اس کے بعد خود اسی کے اندر اس نے تناسل کی طاقت رکھ دی جس سے بے شمار افراد توالد و تناسل کے ذریعے سے وجود میں آتے چلے گئے۔ یہ نظریہ تمام مشہود حقائق (OBSERVED FACTS) کی زیادہ بہتر توجیہ کرتا ہے اور کوئی اعتراض اس پر ایسا نہیں لایا جا سکتا جس کا جواب اس نظریہ میں موجود نہ ہو، نہ کوئی مشکل اس نظریے کی تفصیلات میں کسی جگہ ایسی سامنے آتی ہے جو حل نہ ہو سکتی ہو۔ سوال یہ ہے کہ ہر ممکن التصور مفروضے کو تو قابلِ غور سمجھا جاتا ہے، مگر اس نظریے سے فرار کیوں کیا جاتا ہے؟

شیطان کی حقیقت

سوال۔ جب بھی کسی برائی کے سرزد ہو جانے کے بعد مجھے مطالعۂ باطن کا موقع ملا ہے تو میں نے یوں محسوس کیا ہے کہ خارج سے کسی قوت نے مجھے غلط قدم اٹھانے پر آمادہ نہیں کیا بلکہ میری اپنی ذات ہی اس کی ذمہ دار ہے۔ جب میری جبلّی خواہش میرے فکر پر غالب آجاتی ہے اور میری روح پر میری نفسانیت کا قبضہ ہو جاتا ہے تو اس وقت میں گناہ کا ارتکاب کرتا ہوں۔ باہر سے کوئی طاقت میرے اندر حلول کر کے مجھے کسی غلط راہ پر نہیں لے جاتی۔ مگر جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ان فکری اور عملی گمراہیوں کا محرک شیطان ہے جو اپنا ایک

مستقل وجود رکھتا ہے۔ یہ دشمنِ انسانیت کبھی خارج سے اور کبھی انسان کے اندر گھس کر اُسے غلط راستوں پہ لے جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا آپ بھی شیطان کو ایک مستقل وجود رکھنے والی ایسی ہستی تسلیم کرتے ہیں جو انسان کو بہکاتی اور پھسلاتی ہے۔

جواب: شیطان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ "جن" کی نوع کا ایک فرد ہے، اور اس نوع کے بہت سے افراد نوعِ انسانی کی طرح مومن بھی ہیں اور کافر بھی۔ نیز شیاطین جن انہی کافروں میں سے ہیں۔ اسی طرح قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جنوں کی نوع ناری الخلقت ہے۔ مجھے اس نوع کے وجود میں کوئی اشکال محسوس نہیں ہوتا۔ مادہ اور قوت (ENERGY) کے متعلق ہماری معلومات درحقیقت ابھی بالکل ابتدائی ہیں۔ قوت کے مادی صورت اختیار کرنے کے بعد کی حالتوں کے متعلق تو ہم نسبتہً کچھ زیادہ جانتے ہیں، مگر مادی صورت اختیار کیے بغیر محض قوت رہنے کی حالت میں وہ کیا کیا کچھ ہو سکتی ہے، اس علم کی سرحد سے ابھی ہم آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے، اور آخر کیوں ممکن نہیں ہے کہ محض توانائی ہونے کی حالت میں بھی مختلف انواع کی موجودات اس کائنات میں ہوں؟ اور ان میں بعض قسم کی موجودات ایسی بھی ہوں جس کے افراد شعور و ارادہ اور حرکت و عمل کی قدرت کے ساتھ اپنی ایک مستقل ذات رکھتے ہوں؟ شیطان میرے نزدیک اسی نوعیت کی ایک مخلوق ہے اور یہ مخلوق بھی ہماری طرح اس کرۂ زمین میں پائی جاتی ہے۔

رہا ہمارے نفس کے ساتھ اس کا ربط (CONTACT)، اور اس کا ہمارے اندر کے معرکۂ خیر و شر میں شر کے رجحانات کو تقویت پہنچانا، تو یہ بھی کوئی ناقابلِ یقین یا ناقابلِ تعقل بات نہیں ہے۔ اپنے نفس کے متعلق ابھی ہماری معلومات بہت کم ہیں اور اس کی ترکیب کی گتھیوں کو ہم سلجھا نہیں سکے ہیں۔ یہ بات بعید نہیں کہ جس وقت ہم اپنے اندر ایک کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں اور یہ آخری فیصلہ ابھی ہم نے نہیں کیا ہوتا ہے کہ خیر اور شر میں سے کس پہلو کو انتخاب کریں اس وقت کوئی غیر محسوس خارجی مؤثر ہمارے رجحاناتِ شر کو تقویت پہنچاتا ہو، اور اسی طرح کوئی دوسرا غیر محسوس خارجی مؤثر (یعنی فرشتہ) ہمارے رجحاناتِ خیر کو مدد دے رہا ہو، بغیر اس کے کہ ہم اس کے عمل اور طریقِ عمل کا ادراک کر سکیں۔ اگرچہ اس کا ادراک ہمیں نہیں ہوتا، لیکن اگر ایسی کشمکش کے مواقع پر بہت زیادہ غور سے اپنی اندرونی حالت کا جائزہ لیا جائے تو ایک

دھندلا سا خیال ضرور آتا ہے کہ خارج سے بھی کوئی چیز ہمارے داخلی عوامل کے ساتھ کام کر رہی ہے میں نے خود کبھی کبھی اس کو محسوس کیا ہے۔ بہر حال کسی غیر مادی صاحبِ تشخص ہستی کا ہمارے قوائے نفسانی سے براہِ راست ربط قائم کرنا اور ان کو متاثر کرنا کوئی بعید از امکان بات نہیں ہے اور نہ اس کا تصوّر کرنا کچھ مشکل ہے۔ الّا یہ کہ ہم پہلے ہی سے یہ فرض کر بیٹھیں کہ اس کائنات میں ہماری موجودات کے سوا اور کسی قسم کی موجودات نہیں ہیں۔

انسانیت کے مورثِ اعلیٰ۔ حضرت آدمؑ

سوال (۱) قرآنِ مجید نے حضرتِ آدم علیہ السلام کا ذکر جس انداز سے کیا ہے وہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ نوعِ بشری کے یہ سب سے پہلے رکن بڑے ہی مہذب تھے۔ اس سلسلہ میں جو چیز میرے ذہن میں خلش پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس متمدن انسان کے صلب سے وحشی قبائل آخر کس طرح پیدا ہو گئے۔ تاریخ کے اوراق پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قبائل اخلاق اور انسانیت کی بالکل بنیادی اقدار تک سے ناآشنا ہیں۔ نفسیات بھی اسی امر کی تائید کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وحشی انسانوں اور حیوانوں کے مابین کوئی بہت زیادہ فرق نہیں، سوائے اس ایک فرق کے کہ انسان نے اپنی غور و فکر کی قوتوں کو کافی حد تک ترقی دے دی ہے۔ یہ چیز تو مسئلۂ ارتقاء کو تقویت پہنچاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس معاملہ میں رہنمائی فرما کر میری اس خلش کو دُور کریں گے اور اس امر کی وضاحت فرمائیں گے کہ ابتدائی انسان کی تخلیق کی نوعیت کیا تھی اور اس کے جبلّی قویٰ کس سطح پر تھے؟

(ب) حضرت آدم علیہ السلام تاریخ کے کس دَور میں پیدا ہوئے؟ اس ضمن میں مذہب جو معلومات ہمیں فراہم کرتا ہے نفسیاتی اور ارضیاتی حقائق ان کی تائید نہیں کرتے۔ کیا آدم اور حوّا کا یہ قصہ ایک تمثیلی اور مجازی چیز نہیں؟

جواب (۱) میں حضرت آدمؑ کو نوعِ انسانی کا پہلا فرد سمجھتا ہوں اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ پہلے فرد کی براہِ راست (DIRECT CREATION) تخلیق کی گئی تھی، اور یہ کہ اس فرد کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ نہیں دیا گیا کہ خود ہاتھ پاؤں مار کر فکری اور عملی تہذیب کی جانب پیش قدمی کرے، بلکہ اسے خداوند تعالیٰ کی رہنمائی و نگرانی میں وہ ابتدائی تربیت بھی دی گئی جو تہذیبِ انسانی کی داغ بیل ڈالنے کے لیے لازماً درکار تھی۔ آپ غور کریں تو خود سمجھ سکتے ہیں کہ ہر نوع کے افراد کو زندگی کا آغاز کرنے کے لیے کچھ بنیادی رہنمائی درکار ہوتی ہے۔ حیوانات کے افراد کو یہ رہنمائی بہت کم اور محدود پیمانے پر درکار ہوتی ہے اور وہ ہر بچہ حیوان کو بالعموم اس کے ماں باپ یا دوسرے افرادِ نوع سے ملتی ہے۔ انسان کا بچہ اس سے بہت زیادہ اور بڑے پیمانے پر نگہبانی و رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے جو اگر نہ ملے تو وہ یا تو زندہ ہی نہیں رہ سکتا، یا بچہ انسان کی حیثیت سے نشوونما نہیں پا سکتا۔ یہ ابتدائی اور ضروری رہنمائی میرے نزدیک ہر نوع کے پہلے فرد کو، اور اسی طرح نوعِ انسانی کے بھی اولین فرد کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی۔

یہ بات کہ انسان کبھی تہذیب سے بالکل عاری اور اپنی حالت میں پوری طرح حیوانات کی سطح پر تھا، محض ایک مفروضہ ہے جو اس دوسرے مفروضے پر قائم کیا گیا ہے کہ انسان حیوانات میں سے ترقی کرتا ہوا حالتِ انسانی کو پہنچا ہے۔ اس وقت تک کے مشاہدات میں کوئی چیز ان دونوں مفروضات کی تائید کرنے والی (تائید اس معنی میں کہ انہیں ثابت کر دے) نہیں ملی ہے۔ اس کے برعکس قدیم ترین آثار میں بھی جہاں کہیں انسان (نہ کہ کوئی خیالی مفقود حلقہ MISSING LINK) ملا ہے وہیں تہذیب کے بھی نشانات ملے ہیں، چاہے وہ کیسے ہی ابتدائی مرحلے کے ہوں۔ خالص غیر مہذب و غیر متمدن انسان، مثلِ حیوان، اب تک کہیں نہیں پایا گیا ہے۔ جن کو آپ غیر متمدن (SAVAGES) کہتے ہیں، ان میں اور حیوانی زندگی کی برتر صورتوں میں اگر واقعی تقابل کیا جائے تو ایسے بنیادی فرق پائے جائیں گے کہ حیوان کی کسی اونچی سے اونچی قسم کو انسان کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ وحشیانہ حالت سے بھی کوئی نسبت نہ ہوگی۔ یہ دراصل ارتقا خولیا ہے جس کی وجہ سے کچھ سطحی تشابہات کو انسان و حیوان میں مماثلت کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ بالکل ابتدائی حالت میں بھی چند چیزیں ایسی ہیں جو قطعی طور پر انسان اور حیوان

میں فرق کر دیتی ہیں۔ مثلاً حیا جس کا اظہار اعضائے جنسی کو چھپانے اور مباشرت میں اخفاء سے کام لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ الفاظ اور اشارات کی شکل میں اظہارِ خیال جو حیوانات کی آوازوں سے بالکل بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ قوتِ ایجاد جو حیوانات کی جبلّت کے تحت لگی بندھی صنعتوں سے کلیتہً اپنی نوعیت میں بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ ارادی اور غیر ارادی افعال میں فرق کرنا اور ارادی افعال پر اخلاقی احکام لگانا جو حیوانات کی کسی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ شکل میں بھی موجود نہیں ہے۔ مذہبی حس جو حیوانات میں مفقود ہے مگر انسانوں کا کوئی گروہ انتہائی وحشت کی حالت میں بھی اس سے خالی نہیں پایا گیا ہے۔

(ب) آدم کا زمانہ وجود متحقق کرنے کا ابھی تک کوئی ذریعہ نہیں ملا ہے۔ کوئی علم اس معاملہ میں یقینی یا قریب بہ یقین معلومات فراہم نہیں کرتا۔ یہ علم صرف انبیاء اور کتبِ آسمانی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچا ہے۔ البتہ علم تناسل اور قیاس عقلی کی مدد سے دو نظریے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ موجودہ انسانی نسل متعدد انسانی مورثوں کے نطفے سے نکلی ہو۔ یا پھر یہ کہ اس کا ایک ہی مورث ہو اور اس سے حیاتِ انسانی ان بے شمار افراد تک منتقل ہوئی ہو۔ آپ خود دیکھ لیں کہ ان میں سے کونسا نظریہ زیادہ قرینِ عقل ہے۔

مسئلۂ تقدیر

سوال: مجھے آپ کی تصنیف مسئلۂ جبر و قدر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ آپ نے نہایت ہی علمی انداز میں اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر جبر و قدر کے جو مباحث ملتے ہیں اُن میں قطعاً کوئی تناقض نہیں۔ اس معاملہ میں تو میری تشفی ہو چکی ہے مگر ذہن میں پھر بھی دو سوال ضرور اُبھرتے ہیں، ایک یہ کہ کیا انسان کی تقدیر پہلے سے طے ہے اور مستقبل میں جو واقعات و حوادث اُسے پیش آنے والے

ہیں وہ ازل سے ہی مقرر اور متعین ہیں۔ اور اب ان کے چہرے سے صرف نقاب اٹھانا باقی رہ گیا ہے۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ صورتِ حال انسان کے ارادہ و عمل کی آزادی کے ساتھ کیسے میل کھا سکتی ہے؟

جواب: تقدیرِ سابق اور انسان کی آزادیٔ و ارادہ کے درمیان کس نوعیت کا تعلق ہے اور ان دونوں کے حدود کیا ہیں، یہ مسئلہ درحقیقت ہماری گرفت سے باہر ہے اور اس کے متعلق کوئی یقینی بات کہنے کی پوزیشن میں ہم نہیں ہیں۔ البتہ اصولی طور پر تین باتیں ایسی ہیں جو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں:

ایک یہ کہ انسان اپنی تقدیر خود بنانے پر کلیتہً قادر نہیں ہے بلکہ جو طاقت پوری کائنات کا نظام چلاتی ہے وہی انسان کی بحیثیتِ نوع، بحیثیتِ قوم، بحیثیتِ گروہ اور بحیثیتِ فرد تقدیر بناتی ہے۔ البتہ اس کا ایک حصہ (جس کی مقدار ہمیں نہیں معلوم) انسان کے دائرۂ اختیار میں بھی ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کا علمِ سابق انسان کے تمام آنے والے حالات پر حاوی ہے۔ خدائی کا عظیم الشان کام ایک دن بھی نہیں چل سکتا اگر خدا اپنی کائنات میں ہونے والے واقعات سے بے خبر ہو اور کوئی واقعہ جب پیش آجائے تب ہی اسے خبر ہو۔

تیسرے یہ کہ اللہ کی قدرت نے انسان کو محدود پیمانے پر کچھ اختیارات دیئے ہیں جن کے لیے آزادیٔ ارادہ ناگزیر ہے اور اللہ کا علم خود اسی کی قدرت کے کسی فعل کو باطل نہیں کرتا۔

تعارفِ کتب

ISLAM AND THE ARABS گزشتہ دس سالوں میں اسلام اور دنیائے اسلام کو سمجھنے کے لیے غیر مسلموں نے جس قدر علمی کاوشیں کی ہیں اُن میں یہ کتاب ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اس کے مصنف پروفیسر ROM LANDAU مراکش کے سیاسی اور معاشرتی حالات کے ایک بہت بڑے مبصر خیال کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے مراکش کے بارے میں بہت سی اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن میں دعوتِ مراکش، حُسنِ مراکش اور فرمانروائے مراکش خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فاضل مصنف اس وقت سان فرانسسکو کے ایک کالج میں اسلامی علوم کے استاد ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب کو انگلستان کے مشہور و معروف اشاعتی ادارے جارج ایلن نے اپنی روایات کے مطابق نہایت اونچے طباعتی معیار کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب کی قیمت تیس شلنگ ہے۔

اس تالیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مراکش کے ساتھ ایک گہرے تعلق اور رابطہ ہی نے مصنف کے اندر اسلام اور دنیائے اسلام کو سمجھنے کی خواہش پیدا کی اور انہوں نے نہ صرف اس کا مطالعہ کیا بلکہ اپنے حاصلِ مطالعہ کو اس کتاب کی صورت میں مدوّن بھی کیا۔ اسی موضوع پر اُن کی چار دوسری تصنیفات بھی موجود ہیں جن میں تلاشِ حق، اسلامِ عہدِ حاضر میں (بہ اشتراک پروفیسر آربری)، فرانس اور عرب، عربوں کا تہذیب میں حصّہ: اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

پروفیسر صاحب کی اس عرق ریزی کو دیکھ کر جو انہوں نے اسلام اور مسلم ممالک کو سمجھنے سمجھانے میں صرف کی ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کا محرک کیا ہے۔ اس کا جواب انہوں نے خود ہی مندرجۂ ذیل الفاظ میں دے دیا ہے:

"مغربی اہلِ علم نے اسلام اور دنیائے اسلام کے ساتھ کبھی بھی فیاضانہ برتاؤ نہیں کیا لیکن آج اس چیز کی اشد ضرورت ہے۔ اخبار رسائل پر سرسری نگاہ ڈالنے والا بھی اس

انہیں صفحات میں صاحب موصوف نے اسلامی فلسفہ کے متعلق بھی ایک نہایت ہی صحیح بات کہی ہے:

"یہ کہنا قطعاً بے جا نہ ہوگا کہ اسلام فلسفہ سے بالکل بے نیاز ہو سکتا ہے۔ وہ دین جس کا مرکز و محور توحید باری تعالیٰ ہو، جس کی بنیاد حقیقت پسندی پر رکھی گئی ہو اور جو اپنے کلیت پسند مزاج کی وجہ سے زندگی کے سارے گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ وہ حیاتِ انسانی کے بہت سے اعتقادی اور عملی مسائل کا حل تو پیش کرتا ہے مگر اس میں فلسفیانہ موشگافیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے زندگی کے اسرار و رموز کو نہایت سادہ اور واضح انداز میں سمجھایا ہے۔ اسلام عیسائیت سے اس معاملے میں بہت آگے ہے اور ایشیا کے دوسرے مذاہب پر بھی اسلام اس باب میں بہت زیادہ فوقیت اور برتری رکھتا ہے۔"

مسلمان حکماء کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف رقمطراز ہے:

"مسلمان فلسفی قریب قریب انہی مسائل کو حل کرنے میں مصروف رہے جنہوں نے مغربی مفکرین کو آج تک پریشان کر رکھا ہے مثلاً ایک مکمل اور اکمل ذات نے ایک ناقص دنیا کیونکر پیدا کی ہے کثرت میں وحدت کس طرح جلوہ گر ہوئی ہے، کیا انسان خود مختار ہے یا اُس کی تقدیر روزِ ازل سے لکھی جا چکی ہے۔ خدا اگر خیر کا سرچشمہ ہے تو پھر اس دنیا میں شر کیوں موجود ہے۔ مسلمان فلاسفہ نے ان مسائل کو اگرچہ عقلی استدلال کے ذریعہ حل کیا ہے مگر انہوں نے کبھی بھی مذہب کو اپنی خرد کا غلام نہیں بنایا بلکہ اپنی عقل کو ہمیشہ مذہب کے تابع رکھا ...... ان کے افکار و نظریات نے عیسائی علم الکلام اور مغربی فلسفہ پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں اگر یہ کہا جائے کہ عیسائی فلسفہ کو اس معراج تک پہنچانے میں جس پر کہ وہ اس وقت ہے، فارابی، ابن سینا، غزالیؒ اور ابن رشد کا بہت زیادہ دخل ہے۔"

پروفیسر صاحب کو اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ مسلمانوں نے کلاسیکی سکون آفرینی کے نظریہ کی جگہ حرکت اور حرارت کے اصول کو زندگی کا رہبر بنایا اور اس طرح جدید سائنس کی بنا ڈالی۔ اس باب میں جو باتیں انہوں نے فرمائی ہیں وہ فکر انگیز ہونے کی وجہ سے گہری توجہ کی محتاج ہیں۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی

انہیں صفحات میں صاحبِ موصوف نے اسلامی فلسفہ کے متعلق بھی ایک نہایت ہی صحیح بات کہی ہے:

"یہ کہنا قطعاً بے جا نہ ہوگا کہ اسلام فلسفہ سے بالکل بے نیاز ہو سکتا ہے۔ وہ دین جس کا مرکز و محور توحید باری تعالیٰ ہو، جس کی بنیاد حقیقت پسندی پر رکھی گئی ہو اور جو اپنے کلیت پسند مزاج کی وجہ سے زندگی کے سارے گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ وہ حیاتِ انسانی کے بہت سے اعتقادی اور عملی مسائل کا حل تو پیش کرتا ہے مگر اس میں فلسفیانہ موشگافیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے زندگی کے اسرار و رموز کو نہایت سادہ اور واضح انداز میں سمجھایا ہے۔ اسلام عیسائیت سے اس معاملے میں بہت آگے ہے اور ایشیا کے دوسرے مذاہب پر بھی اسلام اس باب میں بہت زیادہ فوقیت اور برتری رکھتا ہے۔"

مسلمان حکماء کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف رقمطراز ہے:

"مسلمان فلسفی قریب قریب انہی مسائل کو حل کرنے میں مصروف رہے جنہوں نے مغربی مفکرین کو آج تک پریشان کر رکھا ہے مثلاً ایک مکمل اور اکمل ذات نے ایک ناقص دنیا کیونکر پیدا کی ہے کثرت میں وحدت کس طرح جلوہ گر ہوئی ہے، کیا انسان خود مختار ہے یا اُس کی تقدیر روزِ ازل سے لکھی جا چکی ہے۔ خدا اگر خیر کا سرچشمہ ہے تو پھر اس دنیا میں شر کیوں موجود ہے۔ مسلمان فلاسفہ نے ان مسائل کو اگرچہ عقلی استدلال کے ذریعہ حل کیا ہے مگر انہوں نے کبھی بھی مذہب کو اپنی خرد کا غلام نہیں بنایا بلکہ اپنی عقل کو ہمیشہ مذہب کے تابع رکھا . . . . . . ان کے افکار و نظریات نے عیسائی علم الکلام اور مغربی فلسفہ پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں اگر یہ کہا جائے کہ عیسائی فلسفہ کو اس معراج تک پہنچانے میں جس پر کہ وہ اس وقت ہے، فارابی، ابنِ سینا، غزالیؒ اور ابن رشد کا بہت زیادہ دخل ہے۔"

پروفیسر صاحب کو اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ مسلمانوں نے کلاسیکی سکون آفرینی کے نظریہ کی جگہ حرکت اور حرارت کے اصول کو زندگی کا رہبر بنایا اور اس طرح جدید سائنس کی بنا ڈالی۔ اس باب میں جو باتیں انہوں نے فرمائی ہیں وہ فکر انگیز ہونے کی وجہ سے گہری توجہ کی محتاج ہیں۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی

تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں نے علمِ طب کو ترقی کے آخری زینہ تک پہنچایا۔ ہسپتالوں کا قیام انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بغداد میں پہلا ہسپتال نویں صدی میں خلیفہ ہارون الرشید کے وقت میں قائم ہوا اور دو صدیوں کے اندر ان کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوگیا۔ ان ہسپتالوں کے ساتھ طب کی تعلیم کے لیے مدارس بھی موجود ہوتے تھے جہاں سے ہر سال اطبا کی نئی کھیپ تیار ہوتی۔ اسی سلسلہ میں فاضل مصنف فرماتے ہیں :

"ہمارے پاس اس امر کو ماننے کے لیے کافی وجوہ ہیں کہ اہلِ یورپ کے اندر صلیبی جنگوں میں جو ہسپتالوں کے قیام کا احساس پیدا ہوا، اُس کے محرک عرب ہی تھے۔ اس وقت تک دمشق اور قاہرہ میں بڑے بڑے ہسپتال معرضِ وجود میں آچکے تھے۔ پیرس میں پہلا ہسپتال لوئی نہم نے صلیبی جنگوں سے واپس آکر قائم کیا۔ عرب اطبا، عیسائی ڈاکٹروں کو کچھ بہت زیادہ قدر و منزلت کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ بلکہ اپنے رسائل میں ان لوگوں کی جہالت اور نافہمی کا اکثر اوقات مذاق اُڑاتے۔ زوال روما کے بعد یورپ کی تاریکی میں جب علم کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو مغربی علماء عربی علوم اور عرب علماء اور فضلاء کی تصنیفات پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے لاطینی زبان میں ان کے ترجمے کیے۔ یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں بطورِ نصاب انہیں شامل کیا گیا۔"

فاضل مصنف نے حضور سرورِ کائنات کے بارے میں اپنے عیسائی بندوں کی پھیلائی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کی بھی تردید کی ہے۔ اس سلسلہ میں اُن کے یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں :

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک نہایت مشکل مگر مہتم بالشان کام تھا۔ وہ کام جس کو کوئی کاذب (جیسا کہ بعض مغربی مصنفین نے دعویٰ کیا ہے) پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔ ان لوگوں کا یہ الزام کہ حضور پر جن اوقات میں وحی نازل ہوتی تھی ان میں درحقیقت انہیں مرگی کا دورہ پڑتا تھا (معاذ اللہ) بالکل لغو اور بے بنیاد ہے۔ اس مرض کے حملے کے وقت آخر کس طرح ایسے مربوط اور فکر انگیز افکار زبان سے نکل سکتے ہیں جو ہمیں قرآن مجید میں ملتے ہیں۔ اُس بے مثال خلوص سے جس سے حضورؐ نے اپنا کام شروع کیا، اس مکمل اعتماد سے جو اُن کے ماننے والے اُن پر رکھتے تھے اور صدیوں کی گواہی سے اس باطل خیال کی تردید ہوتی ہے۔ کسی ذہین سے ذہین کاذب کی مذہبی فریب کاریاں اتنی

دیر تک کبھی نہیں چل سکتیں۔ اسلام نہ صرف تیرہ سو سال سے زندہ چلا آرہا ہے بلکہ اس کے پیروؤں کی تعداد دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ تاریخ میں کسی ایسے مفکری کی کوئی مثال نہیں ملتی جس کی دروغ گوئیوں سے دنیا کی عظیم الشان سلطنتیں قائم ہوئی ہوں اور بہترین تہذیبوں نے جنم لیا ہو۔"

پروفیسر صاحب نے اپنی اس تالیف میں اسلام کے مزاج کا ذکر کرتے ہوئے بالکل درست کہا ہے کہ اسلام حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کے لیے واضح ہدایت دیتا ہے۔ اس دین میں رہبانیت نہیں

"اسلام ایک اجتماعی دین ہے جس میں ملت کا مفاد دوسرے سب مفادات پر غالب ہے۔"

لیکن اسی نقطۂ نظر میں فاضل مصنف نے ایک زبردست ٹھوکر بھی کھائی ہے۔ اسلام اگرچہ زندگی کے سارے گوشوں کا احاطہ کرتا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کے ہاں فرد کی کوئی حیثیت ہی نہیں اور وہ اجتماعیت کے سیلِ بے پناہ میں محض ایک قطرہ ہے۔ فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل ہی دینِ حق کا مطلوب و مقصود ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے۔ خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف فرد ہی کو دعوت دی گئی ہے۔ حقوق اور فرائض فرد ہی پر عائد کیے گئے ہیں۔ امر و نہی کے احکام فرد کو ہی دیئے گئے ہیں۔ الغرض اسلام کے فکر و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتدا میں عامل کی حیثیت سے اور انتہا میں نتیجۂ عمل پانے والے کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن چونکہ انسان کی ترقی کا راستہ اجتماعی زندگی سے ہی ہو کر گزرتا ہے اور فرد کی تکمیلِ ذات اجتماعی زندگی کے اندر ہی ہو سکتی ہے، اس بنا پر اسلام نے حیاتِ اجتماعی کے لیے بھی اصول دیئے ہیں۔

اس کے علاوہ کتاب میں اور بھی بہت سی فکری لغزشیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مثلاً یہ سمجھنا کہ عرب کے لق و دق ریگزاروں نے خدا کی قہاری اور جباری کا تصور پیدا کیا بالکل غلط ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ اسلام نے اللہ کی جو صفات بیان کی ہیں ان میں قہر رحم پر غالب ہے۔ قرآن مجید کی پہلی صورت ہی اس بات کی تردید کرتی ہے۔

پھر پروفیسر صاحب کی یہ بات بھی ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک طرف تو وہ وحی اور الہام کے قائل ہیں اور دوسری طرف ایمانیات کو جغرافیائی ماحول کا مظہر خیال کرتے ہیں۔ وحی الٰہی نہ تو انسان کی کسی

داخلی کیفیت کا اظہار ہوتی ہے اور نہ ہی جغرافیائی حالات کی کرشمہ سازی۔ وہ خدا کا وہ پیغام ہے جو خالقِ کائنات پوری حفاظت کے ساتھ اپنے پیغمبر پر نازل فرماتا ہے۔ اس میں کسی بشر کے اپنے ذاتی احساسات یا خارجی اثرات کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔

ان فروگزاشتوں کے باوجود کتاب میں بہت سی مفید باتیں بھی ملتی ہیں اور انہیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ فاضل مصنف سے اگرچہ بہت سی کوتاہیاں بھی ہوئی ہیں مگر ان کی نیت بخیر ہے اور اہلِ مغرب کو دنیائے اسلام سے متعارف کرانے کے معاملے میں وہ بہت حد تک مخلص ہیں۔

اشارات (صفحہ ۶۴ سے آگے)

وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (الغاشیہ)

آسمان کس طرح بلند کیا گیا ہے۔ پہاڑ کیسے جمائے گئے ہیں فرشِ زمین کیسے بچھایا گیا ہے۔

صانعِ حقیقی کی ہر شے اپنے حسنِ تخلیق اور حسنِ ترتیب سے خالق کے وجود کی گواہی دیتی ہے۔ اُس کی صنعت گری کے معمولی سے معمولی نمونے اور اُس کی تخلیق کے بڑے سے بڑے شاہکار سب درسِ معرفت دیتے ہیں اور اس حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں کہ کائنات کا یہ حیرت انگیز کارخانہ ایک ترتیب اور قاعدہ سے برابر چل رہا ہے۔ اور تمام نظامات ایک ہی اصول پر حرکت کر رہے ہیں کیا مجال کہ اس کارخانہ کی کوئی چیز اپنی حد سے تجاوز کرے۔ اس کی صنعت ہر عیب سے پاک اور اس کا نظام ہر ستم سے خالی ہے۔

مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ. ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ۔ (۶۷-۱)

کیا تو رحمٰن کی تخلیق میں کوئی معمولی سے معمولی فرق بھی دیکھتا ہے؟ پھر نگاہ کر کیا کوئی رخنہ دکھائی پڑتا ہے۔ پھر دہرا کر دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر واپس پلٹ آئے گی۔ (مگر کوئی نقص نہ پا سکے گی)

مطبوعات

احمدیہ تحریک | تالیف ملک محمد جعفر صاحب ایڈووکیٹ۔ طابع وناشر سندھ ساگر اکادمی۔ لاہور
قیمت پانچ روپے صفحات ۳۰۰۔ طباعت کا معیار گوارا۔

گزشتہ چند برسوں میں مسلمانوں کے تجدد پسند طبقے نے دین کے معاملے میں ذہنی آوارگی کی جو فضا پیدا کی ہے یہ کتاب اُس کا ایک نہایت ہی "نادر نمونہ" ہے۔ اس ایک تصنیف کو دیکھ کر اس گروہ کی فکری بے راہ روی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور ایک انسان کے لیے یہ جاننا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ عقلیت پرستی کے یہ نعرے اور اسلاف سے بغاوت کے یہ احساسات امتِ مسلمہ کے اندر کس قسم کی گمراہیاں پھیلانے کا موجب ہوں گے۔

کتاب کے مصنف چونکہ ایک ایڈووکیٹ ہیں اس لیے اُن سے بجا طور پر توقع تھی کہ وہ قادیانی تحریک کا نہایت ہی دیدہ وری سے تجزیہ کریں گے مگر کتاب کے مطالعہ کے بعد ہمیں شدید مایوسی ہوئی۔ انہوں نے کتاب کا نام تو "احمدیہ تحریک" رکھا ہے مگر اس نام کی آڑ میں انہوں نے اسلام کے ساتھ صریح زیادتیاں کی ہیں اور بعض مقامات پر تو اُن کے افکار کے ڈانڈے الحاد سے جا ملتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے وہ بڑا ہی غلط اور کسی پڑھے لکھے آدمی کے معیار سے بہت فروتر معلوم ہوتا ہے۔ ملک صاحب نے مسلمانوں کی نظر میں حدیث اور فقہ کو بے وقعت بنانے کے لیے یہ بہانہ تراشا ہے کہ ان سے مرزا غلام احمد قادیانی اور اُس کے معتقدین کو اپنے گمراہ کن خیالات کے لیے مواد فراہم ہوا ہے۔ اس منطق کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کی رُو سے تو قرآن مجید کو بھی معاذ اللہ رد کر دینا چاہیے۔ کیونکہ مرزا غلام احمد نے اس کی بعض آیات میں بھی شرمناک تحریفات کی ہیں۔ اور خود ملک صاحب نے اپنی تصنیف میں متعدد مثالوں کے ذریعہ اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ جس شخص کی نظر میں کجی اور نیت میں فتور ہو وہ تو صحیح سے صحیح چیز کے اندر بھی بڑی آسانی کے ساتھ فتنے تلاش کر سکتا ہے

اس بنا پر ہم اگر دین کی بنیادوں کو ڈھانا شروع کر دیں تو بالآخر اس کی ساری عمارت ہی منہدم کرنی پڑے گی۔ اور عین ممکن ہے کہ فتنہ جُو کو ہم یہ "خدمتِ جلیلہ" سرانجام دینے کے بعد بھی مطمئن نہ کر سکیں۔

یوں تو یہ ساری کتاب ہی گمراہ کن ہے مگر اس کا آخری باب تو ایسا ہے جس میں کھلے ہوئے الحاد کی تلقین کی گئی ہے۔ اور اس معاملہ میں بھی لطف کی بات یہ ہے کہ اپنی تائید میں علامہ اقبال مرحوم کی کتاب "اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید" کے بعض اقتباسات نقل کیے ہیں۔ اقبالؒ اگر آج زندہ ہوتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ ان کے نام کو دین کے اندر کس قسم کے نئے نئے فتنے پھیلانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

علامہ مرحوم کی کتابوں کو لاتعداد لوگوں نے پڑھا ہے۔ ان میں علماء بھی ہیں اور عامی بھی پھر اُن کے پاس بیٹھنے والے اور اُن کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے والوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ ان کے ناقدین اور شارحین کی بھی کمی نہیں مگر کسی نے آج تک یہ نہیں کہا کہ ختمِ نبوت سے علامہ مرحوم کی مراد یہ تھی کہ اب انسان ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہو گیا ہے اور اسے محض اپنی عقل پر بھروسا کر کے زندگی میں آگے بڑھنا چاہیے۔ ان کے کلام سے اس نکتہ کے اخذ کرنے کا فخر صرف ملک صاحب کو ہی حاصل ہوا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جس پر انہوں نے غلام محمد پرویز صاحب سے بھی اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ پرویز صاحب ختمِ نبوت کے معاملے میں علامہ مرحوم کے مطلب کو صحیح طور پر پا نہیں سکے۔

ملک صاحب یوں تو اپنے زعم میں حدیث اور فقہ کے بخیے ادھیڑ رہے ہیں مگر ان کی دینی معلومات کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر جگہ تمیم الداری کو "تمیم دارمی" لکھتے ہیں۔

الٰہی! اس دَور کے فتنے کتنے عجیب و غریب ہیں اور ان کے اٹھانے والے کتنے جری اور بے باک ہیں!

ہم ایمانداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب لکھ کر ملک صاحب نے دین کی قطعاً کوئی خدمت سرانجام نہیں دی بلکہ انہوں نے الحاد و زندقہ کو قوت فراہم کی ہے۔ اور سندھ ساگر اکادمی نے بھی دنیا اور آخرت کے اعتبار سے کوئی نفع کا سودا نہیں کیا ہے۔ وہ اکادمی جو شاہ ولی اللہؒ کے افکار پھیلانے کے لیے قائم کی گئی ہو، اسے اتنا بے راہ اور غیر محتاط تو نہیں ہونا چاہیے کہ وہ لالچ میں آ کر الحاد پھیلانا شروع کر دے۔

(بقیہ اشارات)

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۴۱-۵)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔

یہ دن اور رات کا الٹ پھیر، یہ سورج اور چاند کی روشنی، اور ایک مقررہ رفتار کے ساتھ لگے بندھے پروگرام کے تحت اُن کا طلوع و غروب اس بات کی دلیل ہے کہ اس اشہبِ ایام کے دوش پہ کوئی سوار ہے جو اس کے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۲-۲۰)

جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں بے شمار نشانیاں ہیں۔

ان آیات میں مظاہرِ کائنات کی جن نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے انسانی زندگی سے ان کا نہایت گہرا تعلق ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق ایک صانع کے وجود کی شہادت دیتی ہے۔ گردشِ لیل و نہار، لاکھوں من وزنی جہازوں کا پھولوں کی طرح سطحِ آب پر تیرنا، مینہ کا برسنا اور اُس سے زمین کا سیراب ہونا اور پھر اس سے انواع و اقسام کی زندگی کا نمودار ہونا، سب اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ کوئی قوتِ ناظمہ کائنات کے اس وسیع کارخانے کو بڑی حکمت اور دانائی سے چلا رہی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ
عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی
یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ
رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۔ وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ
وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ۔

وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں۔ پھر وہ اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لیے چل رہی ہے اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے۔ اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بیشمار دوسری نشانیوں میں ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ اُس نے غیر محسوس اور غیر مرئی سہاروں پر فلک کو قائم کر رکھا ہے۔ اس فضائے بسیط میں اگرچہ بظاہر کوئی چیز نظر نہیں آتی جو ان بے حد و حساب اجرام فلکی کو تھامے ہوئے ہو لیکن اگر ذرا چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خالقِ کائنات کی اَن دیکھی طاقت انہیں اپنے اپنے مقام و مدار پر روکے ہوئے ہے اور ان سے اپنے ضابطے کی پابندی کرا رہی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے۔

قرآن مجید میں اس موضوع پر اس کثرت کے ساتھ آیات موجود ہیں کہ ان سب کا یہاں احاطہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ کلام پاک کی شاید ہی کوئی آیت ایسی ہو جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ انسان کو بار بار اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ مناظرِ فطرت، خوشبوئیں، روشنی اور اندھیرے کا سنجوگ، سطحِ سمندر پر کشتیوں کا چلنا، آسمانوں کا غیر مرئی سہاروں پر کھڑا ہونا سب ایک خالق اور مالک کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو پکار کر کہتا ہے،

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ

کیا وہ دیکھتے نہیں کہ اونٹ کیسے بنائے گئے ہیں،

(باقی صفحہ [illegible] پر)

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ کی مطبوعات

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودوی سے ان کی حسب ذیل کتب کے جملہ حقوق طباعت و اشاعت حاصل کر لئے ھیں۔

(۱) رسالہ دینیات
(۲) خطبات
(۳) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول مبادی
(۴) اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر
(۵) تفہیمات حصہ اول
(۶) تفہیمات حصہ دوم
(۷) تنقحات
(۸) رسائل و مسائل حصہ اول
(۹) رسائل و مسائل حصہ دوم
(۱۰) رسائل و مسائل حصہ سوم (زیر ترتیب)
(۱۱) قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں
(۱۲) اسلام اور جدید معاشی نظریات
(۱۳) سود
(۱۴) مسئلہ ملکیت زمین
(۱۵) تعلیمات
(۱۶) پردہ
(۱۷) حقوق الزوجین
(۱۸) تجدید و احیائے دین
(۱۹) مسئلہ جبر و قدر
(۲۰) اسلام اور ضبط ولادت
(۲۱) اسلام کا نظام حیات
(۲۲) اسلامی دستور کی تدوین
(۲۳) اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر
(۲۴) زندگی بعد موت
(۲۵) اسلام اور جاھلیت
(۲۶) اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر
(۲۷) دین حق
(۲۸) شہادت حق
(۲۹) انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
(۳۰) اسلام کا نظریہ سیاسی
(۳۱) اسلامی حکومت کس طرح قائم ھوتی ھے
(۳۲) یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ
(۳۳) مسلمانوں کا ماضی و حال و مستقبل
(۳۴) قرآن فہمی کے بنیادی اصول
(۳۵) الجہاد فی الاسلام
(۳۶) سلاجقہ
(۳۷) تاریخ دکن
(۳۸) مرتد کی سزا اسلامی قانون میں
(۳۹) ذمیوں کے حقوق
(۴۰) پاکستان کے لئے صحیح نظام تعلیم
(۴۱) اسلامک لا اینڈ کانسٹی ٹیوشن (انگریزی)
(۴۲) ٹو ورڈس انڈر اسٹینڈنگ اسلام (انگریزی)

رسالہ دینیات

از

سید [redacted] ابوالاعلیٰ مودودی

ھائی سکولوں کے طلبا کے لئے بہترین نصاب تعلیم اور عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے دین اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کا بہترین ذریعہ

دین اسلام کیا ھے ؟ یہ اور یہی ایک دین حق کیوں ھے ؟ اس کے بنیادی عقائد اور ان کے تقاضے کیا ھیں ؟ اس پر داعی ایمان و عمل ایک آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتا ھے ؟ اس کے عقائد کے عقلی اور سائنٹیفک دلائل کیا ھیں ؟ خدا کے وجود ، اس کے خدائے واحد ھونے ، محمد صل اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کے ھر حیثیت سے آخری نبی ھونے اور روز جزا اور آخرت کے برحق ھونے کا ثبوت کیا ھے ، اسلامی شریعت ، فقہ ، تصوف کی حقیقت ان کا دائرہ عمل اور دین میں ان کا مقام کیا ھے ؟ کلمہ ، نماز ، روزہ اور حج کیا اور کس لئے ھیں؟ ان کا فائدہ اور مقصد کیا ھے؟ خدا، بندوں اور خود انسان کے اپنے نفس کے حقوق کیا ھیں ؟ یہ سب کچھ اسی کتاب میں اس عام فہم اور دلنشین انداز میں پیش کئے گئے ھیں کہ ایک عام پڑھے لکھے آدمی سے لیکر ایک عالم اور اونچے تعلیم یافتہ آدمی تک سب اس سے یکساں فائدہ حاصل کر سکتے ھیں ۔

مولانا مودودی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اس دور میں اپنے بندوں کو اپنا دین سمجھانے کی جو بے نظیر صلاحیت بخشی ھے وہ اس رسالہ میں آپ کو پورے جوبن پر دکھائی دے گی ۔ اس میں مصنف نے قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کر دیا ھے اور اول سے آخر تک قرآن مجید ھی کے طرز استدلال کی پیروی کی ھے ۔

رسالہ دینیات وہ کتاب ھے جس سے کوئی گھر خالی نہیں ھونا چاھئے ۔
سائز ۳۰×۲۰/۱۶ صفحات ۱۷۶ ، مجلد معہ گرد پوش قیمت ڈھائی روپے ۔